تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث

رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

قیمت: تین روپے

مجلسِ ترتیب :

مولانا امین احسن اصلاحی

خالد مسعود

جاوید احمد

عبداللہ غلام احمد

ماجد خاور

ناشر : ادارۂ تدبر قرآن وحدیث

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس ، لاہور

تدبر

سلسلہ نمبر ۱ — رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ — مطابق جولائی ۱۹۸۱ء

فہرست مضامین

		صفحہ
تذکرہ وتبصرہ :		
ادارۂ تدبرِ قرآن وحدیث	خالد مسعود	۳
اشاراتِ تدبرِ قرآن :		
سورۂ فاتحہ	خالد مسعود	۱۳
سورۂ بقرہ		۱۵
تدبرِ حدیث :		
حدیثِ جبریلؑ	خالد مسعود	۲۲
تزکیۂ نفس		
تعلق باللہ اور اس کی اساسات	امین احسن اصلاحی	۳۵
شعرِ عرب		
شرح شواہدِ فراہی	جاوید احمد / طالب حسین (مترجم)	۴۲
مراسلہ و مذاکرہ :		
جبر و اختیار کا مسئلہ		۴۵
اسلامی نظامِ معیشت کی صحیح تعبیر	امین احسن اصلاحی / راجد خاور (مرتب)	۴۶
انسانی زندگی کا مقصود۔		۴۸

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ادارۂ تدبّرِ قرآن وحدیث

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ یہ اس سلسلۂ رشد وہدایت کی آخری کڑی ہے جس کا آغاز بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے اس کے پہلے فرد — حضرت آدم علیہ السلام — پر نزولِ وحی سے ہوا اور جس کی تکمیل خدا کے آخری رسول — حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم — پر ہوئی۔ دنیا کی تاریخ میں جس جس قوم کو اس ہدایت کا حامل بنایا گیا وہ اپنے دور کی بہترین قوم تھی۔ فی الحقیقت کسی بھی قوم کی خوش بختی کی معراج اور اس پر ربِ کائنات کے افضال وعنایات کی تکمیل کی صورت یہ رہی ہے کہ اسے ہدایتِ آسمانی کا علمبردار بنا دیا گیا ہے۔ پہلی امتوں میں خدا کے وہ بندے بھی تھے جنہوں نے اس نعمت کا واقعی حق ادا کیا اور وہ بھی تھے جن سے کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ بحیثیت مجموعی وقت گزرنے کے ساتھ یہ ہدایت مسخ ہوجاتی رہی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کو آخری اور مکمل شکل میں قرآن مجید کی صورت میں اتارا اور خصوصی انتظام کے ذریعے اسے محفوظ بھی فرما دیا تاکہ انسان رہتی دنیا تک اس سرچشمۂ ہدایت سے بہرہ ور ہوسکے۔ اس واحد مستند صحیفۂ آسمانی کے حامل ہونے کا شرف امتِ مسلمہ کو حاصل ہے۔

قرآن مجید کا تعلق انسان کی زندگی سے ہمہ جہتی ہے۔ اس نے مالکِ کائنات اور بندے کے باہمی تعلق کو نمایاں کیا ہے، دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت بیان کی ہے اور ان اصولوں کی نشاندہی کی ہے جن کے مطابق انسانوں کے ساتھ خدا نے اب تک معاملہ کیا ہے اور آئندہ کرنے والا ہے۔ قرآن نے انسان کی اصل فطرت کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ساتھ مطابقت رکھنے والا فلسفہ، عقیدہ اور عمل کونسا ہے۔ اس نے یہ واضح کیا ہے کہ زندگی کے گوناگوں پہلوؤں میں، خواہ وہ روحانی ہوں یا مادی، معاشی ہوں یا معاشرتی، نفسیاتی ہوں یا سیاسی، وہ کونسی ہدایت ہے جس کو مشعلِ راہ بنا کر انسان دنیا و آخرت میں کامیاب اور خالق کی نگاہوں میں قدر و منزلت کا حقدار ہوسکتا ہے۔ پس قرآن مجید کی تعلیمات کو نظرانداز کرنے کا مطلب ان تمام خطرات سے دوچار ہوجانا ہے جن سے بچانے کے لیے ربِ کریم نے یہ کتاب اتاری۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر صاحبِ عقل اس سے یاد دہانی حاصل کرے اور اس کی اتباع کرکے خدا کی

سمجھا جائے۔ حضورؐ کی سُنّت کا معتدبہ حصّہ تو اُمّتِ مسلمہ کے تواترِ عملی کے نتیجہ میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ باقی ذخیرۂ احادیث میں رَلا مِلا ہوا ہے۔ مؤخر الذکر حصّہ کی جستجو ایک محنت طلب کام ہے جو علمائے اُمّت ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ بہرحال ذخیرۂ حدیث پر تدبّر، قرآن پر تدبّر ہی کا ایک لازمہ ہے جس کی طرف سے غفلت نہیں کی جا سکتی۔

تدبّرِ قرآن و حدیث کے اس کام کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے اندر وسیع پیمانے پر اس کا اہتمام کیا جائے تاکہ اس کے ذہین طبقہ کے اندر قرآن و حدیث کا حقیقی فہم رکھنے والے پیدا ہوں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضرورت ہمارے ملک کے وہ سینکڑوں دینی مدارس پوری کر رہے ہوں گے جو ملک کے ہر خطّے میں واقع ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کی بات کوئی نہ ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان مدارس کی دینی خدمات کیا ہیں یا دین کو عوام الناس میں رائج کرنے کے لیے انہوں نے کیا کیا اقدامات کئے ہیں، یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ دین میں فکر و تدبّر کا مقصد ان سے پورا نہیں ہو رہا ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں، ایک نظر اپنی مساجد پر ڈال لینا کافی ہوگا۔ مدارس کے تربیت یافتہ علماء کی معلومات، الا ماشاء اللہ، نماز و روزہ کے چند فقہی مسائل تک محدود ہوتی ہیں۔ خطباتِ جمعہ بیشتر بے بنیاد قصّے کہانیوں اور سطحی دینی فکر پر مبنی ہوتے ہیں۔ فرقہ پرستی دین بن گیا ہے اور اسی کی تبلیغ پر زورِ خطابت صَرف کیا جاتا ہے۔ کسی علمی مسئلہ پر بحث شروع ہو جائے تو دینی طبقہ کی علمی کم مائیگی پورے طور پر نمایاں ہو جاتی ہے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ ہمارے علماء زندگی کے عملی مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے کے اہل نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تمام صورتِ حال قرآن و حدیث پر تدبّر کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں کو نظر انداز کر دیا تو وہ اصل تعلیماتِ دین میں خیانت کے مرتکب ہوئے اور ان کے مابین فرقہ پرستی کی ایسی رَو چلی جس نے قیامت تک کے لیے ان کے مختلف فرقوں کو دست و گریباں کر دیا۔ اگر کتاب اللہ کو نظر انداز کرنے کی پاداش میں اہلِ کتاب پر فرقہ پرستی کا عفریت مسلط ہو گیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ربِّ قادر و قیوم اسی جرم کی پاداش میں اُمّتِ مسلمہ سے کوئی مختلف معاملہ کرتا۔ ہمارے نزدیک اس صورتِ حال میں اُمّت پر یہ واجب ہے کہ وہ دین کے مآخذ پر تدبّر کر کے اس خزانۂ حکمت تک رسائی حاصل کرے جو اس میں صراطِ مستقیم کی معرفت اور وحدتِ فکر پیدا کرے۔ اسی مقصد کے تحت ملک میں سینکڑوں دینی مدارس کے قیام کے باوجود کچھ احباب نے مل کر ادارۂ تدبّرِ قرآن و حدیث کی

بنیاد رکھی ہے تاکہ وہ حتی الوسع اس ذمّہ داری کو ادا کرنے کی نیو ڈالیں۔

○

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے ۱۹۵۸ء میں جب اپنی تفسیر تدبّرِ قرآن لکھنے کا آغاز کیا تو اس کے جلد بعد ہی انہوں نے کالجوں کے کچھ فارغین کو قرآن و حدیث کی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس میں پیشِ نظر وہی 'تدبّر' کا مقصد تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ مولانا کا قائم کردہ یہ درس 'حلقۂ تدبّرِ قرآن' کے وجود کا باعث بنا۔ چند سال کے بعد مولانا نے محسوس کیا کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور طلبہ میں 'تدبّر' کا شوق پیدا کرنے میں یہ حلقہ بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔ مولانا کا ارادہ ہوا کہ اس کام کو وسعت دے کر ایک ادارہ کی بنیاد رکھیں لیکن اس وقت وہ اپنی گوناگوں مصروفیات، نقل مکانی اور تفسیر کی تحریر میں انہماک کے باعث اس کے قیام کے لیے مزید کچھ اقدام نہ کر سکے۔ گزشتہ برس تفسیر تدبّرِ قرآن کی تکمیل کے بعد مولانا نے مخلصین اور احباب کے مشورہ سے یہ فیصلہ کیا کہ حلقۂ تدبّرِ قرآن کو وسعت دے کر کوشش کی جائے کہ وہ بتدریج تمام اسلامی علوم کی تحقیق و تنقید کے لیے ایک انسٹی ٹیوشن کی حیثیت حاصل کر لے۔ اس فیصلہ کے تحت مولانا نے تین ارکان — جاوید احمد صاحب، ماجد خاور صاحب اور راقم — پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کر دی جو مجوزہ ادارہ کے لیے ایک دستور مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے دستور کو ان رفقاء کے ایک اجلاس میں پیش کیا گیا جو ادارہ کے مقاصد سے متفق تھے۔ انہوں نے غور و فکر کے بعد اس دستور کو معمولی ترامیم کے ساتھ قبول کر لیا۔ چنانچہ یکم محرم الحرام ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ء کو 'ادارۂ تدبّرِ قرآن و حدیث' وجود میں آیا جس کے رکنِ اول مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔

ادارہ کے قیام کے لیے جو قراردادِ تاسیس منظور ہوئی وہ یہ ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"ہم ارکانِ مجلسِ تاسیس اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبویؐ دینِ اسلام کے مآخذ ہیں۔ افراد میں صراطِ مستقیم کی معرفت اور اُمّتِ مسلمہ میں وحدتِ فکر پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک طرف قرآن پر غور کرنے کی صحیح راہ باز ہو تاکہ اس پر تدبّر کرنے والے اس خزانۂ حکمت تک رسائی حاصل کر سکیں جو قرآن کو ان

کے لیے صحیح معنوں میں وہ کسوٹی بنا دے جس سے وہ زندگی کے ہر گوشہ میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کر سکیں اور دوسری طرف حدیث پر تدبر کی راہ کھلے جس سے نہ صرف اس کی مطابقت قرآنِ مجید کے ساتھ واضح ہو سکے بلکہ حدیث کے ذخیرۂ حکمت سے امتِ مسلمہ پوری طرح بہرہ مند ہو سکے۔

ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید اور حدیثِ نبوی پر تدبر کی صحیح راہ باز ہونے سے اسلامی علم کلام کو اجاگر کرنا اور مروجہ علوم و افکار کو دین کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن ہو سکے گا جس کے نتیجے میں اُمتِ مسلمہ کی فکری و عقائدی اصلاح کا امکان پیدا ہو گا اور اس طرح دین کی اقامت و شہادت کا وہ فریضہ ادا ہو گا جو واجباتِ دین میں سے ہے۔

ہم اس امر کا احساس رکھتے ہیں کہ پیشِ نظر کام کی تکمیل ایک ایسے ادارہ کے قیام سے ممکن ہے جو اپنی تمام تر مساعی قرآنِ مجید اور حدیثِ نبوی پر تدبر کے لیے وقف کر دے اور معارفِ اسلامی کی تحقیق و اشاعت کا اہتمام کرے۔

اس لیے ہم ارکانِ مجلسِ تاسیس ربِ ذوالجلال والاکرام کی رضا کے لیے اسی کے بھروسے پر آج بتاریخ یکم محرم الحرام ۱۴۰۱ھ (مطابق ۱۰/ نومبر ۱۹۸۰ء) بوقت پونے پانچ بجے شام 'ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث' کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔"

ادارہ کی رکن سازی کے بعد دستور میں تجویز کردہ طریق کار کے مطابق مجلسِ عاملہ کا انتخاب ہوا جس میں ارکانِ ادارہ نے حسب ذیل ارکان کو کثرتِ رائے سے منتخب کیا:

مولانا امین احسن اصلاحی، جاوید احمد، خالد مسعود، عبداللہ غلام احمد، ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ، محمد نعمان علی، داؤد احمد، سعید احمد، محمد ارشد، منیر احمد، منصور الحمید، محمد رفیق، محبوب سبحانی، اسحاق علی، ماجد خاور۔

مجلسِ عاملہ نے کثرتِ رائے سے راقم کو ادارہ کے انتظامی معاملات سرانجام دینے کے لیے ناظم منتخب کیا۔ اس کے بعد علمی معاملات میں ادارہ کی رہنمائی کے لیے مجلسِ علمی کا انتخاب ہوا جس میں حسب ذیل ارکان منتخب ہوئے:

مولانا امین احسن اصلاحی، جاوید احمد، خالد مسعود، ماجد خاور، عبداللہ غلام احمد۔

ان ارکان نے مولانا امین احسن اصلاحی کو اپنا صدر چنا اور اس طرح دستور کی رو سے مولانا ظلہٗ 'ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث' کے سربراہ ہیں۔

اس وقت ادارہ کے پیشِ نظر جو کام ہیں وہ مولانا کے الفاظ میں یہ ہیں:

"۱۔ قرآن کے تدبر کا اعلیٰ پیمانہ پر اس طرح اہتمام قائم رکھنا کہ وہ تمام علوم و افکار کے لیے کسوٹی کی حیثیت حاصل کر لے اور اس کے ذریعہ سے ان کے حق و باطل میں امتیاز ہو سکے۔

۲۔ قرآن کی طرح حدیث پر بھی ایسا تحقیقی کام جو حدیث و قرآن اور فقہِ اسلامی میں ایسی کامل ہم آہنگی واضح کر دے کہ گروہی تعصبات اور فرقہ وارانہ اختلافات کالعدم ہو جائیں۔

۳۔ اصل عربی زبان کو جو قرآن و حدیث کی زبان ہے زندہ رکھنے کی کوشش کرنا تاکہ امت کے اندر صاحبِ اجتہاد علماء برابر پیدا ہوتے رہیں اور اس وقت معاشی و کاروباری ضرورت سے عربی سیکھنے کا ذوق جو بڑھ رہا ہے وہ اصل مقصد سے لوگوں کو غافل نہ کرنے پائے۔

۴۔ موجودہ زمانے کے طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی نقطہ ہائے نظر پر تنقید اور ان کے بارے میں قرآن و سنت کے نقطۂ نظر کی خالص علمی سطح پر اس طرح وضاحت کرنا کہ قرآنی علم کلام کی تشکیلِ جدید کی راہ کھلے۔

۵۔ اہم تمدنی و تہذیبی مسائل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کرنا۔

۶۔ ایک لائبریری کا قیام جو دینی علوم پر ریسرچ کرنے والوں کی ضرورت پوری کر سکے۔

۷۔ ایک ایسے علمی جریدہ اور مکتبہ کا قیام و اہتمام جو ادارہ کے تحقیقی کاموں کی اشاعت کا ذریعہ ہو سکے۔"

ان کاموں کی روشنی میں ادارہ نے ماہِ مئی میں دو قسم کے ہفت روزہ دروس کا آغاز کیا۔ ایک قسم کا درس فہم قرآن کے بنیادی اصولوں کی تحقیق پر مبنی تھا جس میں وہ تمام مباحث زیرِ غور آئے جو قرآن مجید پر تدبر کے لیے ضروری ہیں۔ دوسری قسم کے درس میں ان اصولوں کی روشنی میں قرآن مجید کی بعض سورتوں کی تفسیر کی گئی۔ اس سلسلۂ درس میں آئندہ اصولِ فہمِ حدیث اور اصولِ فقہ زیرِ بحث آئیں گے۔

ادارہ کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے اور اس کی تحقیقات کو سامنے لانے کے لیے یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ 'تدبر' کے نام سے ایک مجموعۂ مضامین مناسب وقفوں سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ پہلا مجموعہ

پیشِ خدمت ہے۔ اس سلسلہ کا دوسرا مجموعہ انشاء اللہ تین ماہ کے وقفہ سے شائع ہو گا۔

اس مجلہ میں 'اشاراتِ تدبرِ قرآن' کے عنوان کے تحت مولانا مدظلہٗ کی تفسیر تدبرِ قرآن میں سے ترجمۂ قرآن اور مختصر حواشی دیئے گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان حواشی سے آیات کا ربط بھی واضح ہوتا جائے اور ان کی تاویل کا وہ پہلو بھی سامنے آئے جو نظمِ قرآن کی روشنی میں راجح نظر آتا ہے۔

'تدبرِ حدیث' کے عنوان کے تحت صحیح مسلم کی کتاب الایمان کی مشہور حدیث — 'حدیثِ جبریلؑ' — کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ اس میں حدیث پر غور کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو ادارہ کے پیشِ نظر ہے اور جسے ادارہ کے تعارف میں بدیں الفاظ پیش کیا گیا ہے۔

"صحیح علمی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح پورے ذخیرۂ احادیث پر بھی براہِ راست، ان کے الفاظ، ان کے موقع و محل، ان کے سیاق و سباق، ان کے نظائر و شواہد اور قرآن کے ساتھ ان کی موافقت یا عدم موافقت کے پہلو سے غور کیا جائے۔"

'تعلق باللہ اور اس کی اساسات' مولانا محترم کی زیرِ تالیف کتاب 'تزکیۂ نفس' کا ایک باب ہے۔ اِس کتاب کا موضوع تزکیۂ تعلقات ہے۔ 'تزکیۂ نفس' کا پہلا حصہ سالہا سال سے شائع ہو رہا ہے اور لوگوں میں بہت مقبول ہے۔ اس شائع شدہ حصہ میں تزکیۂ علم اور تزکیۂ عبادات کے ابواب ہیں۔

'شرحِ شواہدِ فراہی'، جاوید احمد صاحب کا ایک تحقیقی کام ہے جس میں ان کے پیشِ نظر ان متفرق اشعار کی شرح کرنا ہے جن سے مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں استشہاد کیا گیا ہے۔ اصل میں یہ کام عربی میں ہے۔ اس مجلہ میں ادارہ کے ایک رکن طالب حسین صاحب نے ایک شعر کی شرح کا اردو ترجمہ دیا ہے۔ چونکہ عربی اشعار کو سمجھنے میں ایک عام قاری کو خاصی مشکل پیش آتی ہے اس لیے توقع ہے کہ جاوید احمد صاحب کا یہ کام مولانا فراہیؒ کی کتب سے استفادہ کو سہل کرنے کا باعث ہو گا۔

'مراسلہ و مذاکرہ' کے عنوان کے تحت تین سوالوں کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ سوالات ادارہ کے ان دروس میں اٹھائے گئے تھے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کے جو جواب مولانا اصلاحی مدظلہٗ نے دیئے ان کو ماجد خاور صاحب نے مرتب کر دیا ہے۔

ادارہ کے پیشِ نظر کاموں میں جیسے جیسے پیش رفت ہوئی وہ اس سلسلۂ مضامین کے ذریعے قارئین کے سامنے لائی جائے گی۔ بہر حال محدود وسائل کے بل بوتے پر کام کا آغاز کر دیا گیا ہے جو اگرچہ پرشکوہ نہیں لیکن ایک علمی ادارہ کے مناسبِ حال ضرور ہے۔ مولانا کے الفاظ میں "یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس مقصد میں کس حد تک کامیابی ہو گی لیکن جو کچھ امکان میں ہے وہ کرنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ سے اچھی ہی اُمید رکھنی چاہیئے۔ اسی توقع پر ایک دینی فریضہ سمجھ کر میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ اپنے امکان کی حد تک اس ادارہ کے کارکنوں سے تعاون کروں گا۔ اور یہی درخواست میں اپنے تمام مخلصین اور دوستوں سے کرتا ہوں کہ وہ اپنے قیمتی مشوروں، اپنے علمی افادات، اپنے وقت اور مال اور سب سے زیادہ اپنی دعاؤں سے اس کے ساتھ تعاون کریں۔"

بقیہ: انسانی زندگی کا مقصود جائے اس نصب العین کے حصول میں عقائد و عبادات، انسان کے سب سے بڑے معاون ہیں اور چونکہ ان میں سے کسی چیز کو بھی اس لیے ضروری نہیں ٹھہرایا گیا ہے کہ خدا کو اس کی ضرورت ہے اس لیے کہ خدا ہر قسم کی ضرورت سے مستغنی ہے۔ اس وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان ساری چیزوں سے خود انسان ہی کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے اور ان عقائد و عبادات سے وہ اپنے آپ کو ان مکارمِ اخلاق سے آراستہ کرتا ہے جو اس کو خلق اور خالق دونوں سے صحیح نسبت بخشنے والے ہوتے ہیں۔

سورہ شمس کی آیت وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس یا بالفاظِ دیگر اپنی ذات اور شخصیت کی اصلاح و تعمیر ہی انسان کا اصل مقصد ہونا چاہیے۔ یہی چیز ہے جس کے متعلق قیامت کے دن اس سے مؤاخذہ ہونا ہے اور اسی چیز سے متعلق اس کو ایک حد تک اختیار ملا ہوا ہے البتہ یہ سوال ہمارے اور علمائے نفسیات کے درمیان اختلافی اور نزاعی ہے کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر کا یہ نصب العین حاصل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کا صحیح طریقہ وہی ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ایسا نہیں ہے جو خطرات سے محفوظ ہو۔

(مرتّب: ماجد خاور)

بقیہ، تعلق باللہ اور اس کی اساسات ہیں کہ میں اسی دل گرفتگی کے ساتھ شہر کی مسجد میں داخل ہوا، وہاں پہنچا تو میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں تھے۔ اس کو دیکھتے ہی میں دفعتہً اپنے رب کے آگے سجدے میں گر پڑا کہ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے جوتی نہیں تو پاؤں تو دیئے ہیں، یہ بیچارہ تو سرے سے پاؤں ہی سے محروم ہے۔

حضرت سعدیؒ نے اپنی اس سرگزشت میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات سمجھا دی ہے کہ خدا کا شکرگزار بندہ بننے کے لیے دنیا کو کس نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ دنیا کو سعدیؒ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ملتی رہتی ہیں جو اُن کو خدا کے شکر پر ابھارتی رہتی ہیں لیکن جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کتنوں کے پاس پاؤں ہی نہیں ہیں، اپنی اس محرومی پر خدا سے شاکی رہتے ہیں کہ ان کے پاس کار نہیں ہے، وہ کبھی بھی خدا کی شکرگزاری کی توفیق نہیں پاتے۔ (جاری ہے)

بقیہ: حدیثِ جابویل ۲ گا کہ فاطرِ کائنات دنیا کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ کیسے معلوم ہو گا کہ علاماتِ قیامت منودار ہو چکی ہیں یا نہیں؟ تو اس کا بھی دو ٹوک جواب دینا ممکن نہیں برسات کے بعد بالکل غیر محسوس طریقہ سے ایک کے بعد دوسری پتی خشک ہو کر درخت سے گرنے لگ جاتی ہے لیکن کئی ہفتے گزرنے کے بعد ہی ایک وقت آتا ہے جب صاف الفاظ میں یہ کہنا ممکن ہوتا ہے کہ موسمِ خزاں آچکا ہے۔ یہی صورت علاماتِ قیامت کے ظہور میں پیش آئے گی۔

حدیث کے آخر میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی کے چلے جانے کے بعد یہ سوال کیا کہ یہ شخص کون تھا؟ جب حضرت عمرؓ اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے تو حضورؐ نے خود بتایا کہ یہ جبریل امینؑ تھے جو دین سکھانے کی غرض سے آئے تھے۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ فرشتے انسانی شکل میں کئی مرتبہ ظاہر ہوئے ہیں اور دین کے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے بھی وہ انبیاء کے پاس آتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریلؑ کی آمد متعدد حدیثوں میں بیان ہوئی ہے۔

اشاراتِ تدبرِ قرآن

خالد مسعود

سُورَۃ فَاتِحَہ

شروع خدائے رحمان و رحیم کے نام سے[۱]

شکر[۲] کا سزاوارِ حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب ۝ رحمان اور رحیم[۳] ۝ جزا و سزا[۴] کے دن کا مالک ۝ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے[۵] ہیں ۝

مضمون: سورۂ فاتحہ میں اس جذبۂ شکر کی تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی پروردگاری، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کے قانونِ عدل کے مشاہدات سے انسان پر طاری ہونا چاہیے۔ اس جذبۂ شکر سے خدا ہی کی بندگی اور اسی سے استعانت کا جذبہ اُبھرتا ہے اور اس سے مزید رہنمائی کی طلب کی تحریک ہوتی ہے۔

۱ آیت بسم اللہ سورہ سے الگ ایک مستقل آیت ہے۔ اس کا مضمون قدیم زمانہ سے اہلِ مذہب میں نقل ہوتا آیا ہے (ہود ۴۱، نمل ۳۰) یہ آیت ایک دعا ہے جو ایک سلیم الفطرت آدمی کی زبان سے ہر قابلِ ذکر کام کرتے وقت نکلنی چاہیے۔ اس کی برکت سے وہ خدا کی دو عظیم صفتوں۔ رحمٰن اور رحیم۔ کا سہارا حاصل کر لیتا ہے۔

۲ حمد کا لفظ ہر قسم کی خوبیوں اور کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے تاہم شکر کا مفہوم اس کا جزوِ غالب ہے۔ خدا کے لیے شکر کا جذبہ اس کی ربوبیت، رحمت اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ سے اُبھرتا ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور کائنات کے ہر گوشہ میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی شکر دین کا نقطۂ آغاز ہے۔

۳ رحمان جس کی رحمت میں جوش و خروش ہے۔ رحیم جس کی رحمت میں دوام و تسلسل اور استواری ہے۔

۴ الدین سے مراد نیک اعمال کا صلہ بھی ہے اور برے کاموں کی سزا بھی۔ لہٰذا یہ لفظ جزا و سزا دونوں پر حاوی ہے۔

۵ طلبِ مدد عبادت و اطاعت کے علاوہ زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین کے اعتراف کے بعد بندہ کے پاس کسی غیر اللہ کو نہ کچھ دینے کو رہا اور نہ اس سے مانگنے کی گنجائش باقی رہی۔

ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش[۶] ○ ان لوگوں کے رستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا[۷]، جو نہ مغضوب[۸] ہوئے اور نہ گمراہ[۹] ○ ۶

۶ے اہدنا میں ہمیں سیدھا رستہ دکھا، کے علاوہ یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کر دے، اس پر چلنے کا ذوق وشوق پیدا کر اور اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کر دے۔ یہی طلب نبیوں اور رسولوں کی بعثت اور وحی کے نزول کا باعث ہوئی ہے۔

۷ے اس سے انعام یافتہ گروہ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں۔ (نساء - ۶۹)

۸ے مغضوبین کی ایک نمایاں مثال یہود ہیں جنہوں نے نعمتِ شریعت کی قدر نہ کی اور اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا۔ (مائدہ - ۶۰)

۹ے گمراہوں کی واضح مثال نصاریٰ ہیں جنہوں نے دین میں غلو کیا اور خدا کے بھیجے ہوئے دین پر قانع نہ ہوئے۔ (مائدہ - ۷۷)

سُورَہ بقَرَہ

شروع خدائے رحمان و رحیم کے نام سے

یہ الف، لام، میم[۱] ہے ○ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں[۲]۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے[۳] ○ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں[۴]، نماز قائم کرتے ہیں[۵] اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶] ○ اور ان کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے

مضمون: سورۂ بقرہ کا مرکزی مضمون دعوتِ ایمان ہے۔ سورۂ فاتحہ میں جس اجمالی ایمان کا بیان ہے اس سورہ میں اس کی تفصیل ہے۔ اس میں واضح طور پر قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ زندگی پر اللہ کا رنگ اسی وقت چڑھتا ہے جب ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت بھی پایا جائے۔

۱ے الٓمٓ سے سورۂ بقرہ کو موسوم کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے حروف بعض دوسری سورتوں کے شروع میں اس طرح آئے ہیں جس طرح کتابوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اہلِ عرب اشخاص، گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں حتیٰ کہ قصائد اور خطبات تک کے نام اسی سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔ نام رکھنے کا یہ طریقہ ان کے ہاں مانوس تھا۔

۲ے الکتاب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اسی اعتبار سے قرآن مجید شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

۳ے یہ بتایا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو قرآن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ فرمایا کہ اس پر ایمان لانے کے لیے قلب کی صلاحیت ضروری ہے اور وہ تقویٰ اور خداترسی سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ کے ثمرات آگے کی آیات میں بیان ہوئے ہیں۔

۴ے یعنی ایمان لانے کے لیے وہ اس بات کے منتظر نہیں ہیں کہ تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں بلکہ وہ عقل، فطرت کی شہادت اور پیغمبر کی دعوت کی بنا پر ان تمام چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

۵ے نماز قائم کرنے میں، نماز کی ادائیگی میں اخلاص اور خشوع وخضوع، اوقات کی پابندی، جمعہ و جماعت کے اہتمام وغیرہ کا مفہوم شامل ہے (اعراف ۲۹، مومنون ۲، بنی اسرائیل ۷۸، حج ۴۱)

آتاری گئی[6] ہے اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے[7] ہیں ۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں[8] ۔ ۵

جن لوگوں نے کفر[9] کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی[10] ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذابِ عظیم ہے ۔ ۷

اور لوگوں[11] میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے[12] ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے ہیں ۔

---

[6] یعنی وہ خدا کی آتاری ہوئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے وہ اس سارے پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے اُترا ہے، خواہ وہ ان کی اپنی قوم کے کسی رسول پر اُترا ہے یا کسی دوسری قوم کے رسُول پر۔

[7] ایمان بالآخرۃ کے مدعی تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں، جو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو خدا کی آتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

[8] یعنی یہی لوگ رب کی ہدایت پر ہیں، اُنہی کیلئے مزید ہدایتوں کے دروازے کھلیں گے اور انہی کے لیے آخرت میں فوز و فلاح ہے۔

[9] اس سے مراد قریش، اہلِ کتاب اور منافقین کے وہ سردار ہیں جن پر قرآن کی دعوت کا حق ہونا واضح ہو چکا تھا، لیکن دُنیا پرستی اور حسد و انانیت نے انہیں بالکل اندھا بہرہ کر دیا تھا اور وہ قبولِ حق کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو چکے تھے۔

[10] جب کسی کے دل و دماغ پر برائی کا رنگ غالب آجائے اور نیکی کی باتوں ہی سے اسے وحشت ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ یہ ختمِ قلوب ایک عذاب ہوتا ہے۔

[11] الناس کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے یہود کا ایک خاص گروہ مراد ہے جو اسلام کی مخالفت مصلحت اندیشی کے رکھ رکھاؤ اور مصالحت پسندی کے روپ میں کرنا چاہتا تھا۔

[12] جو شخص چال بازی کر کے اپنے کسی ناصح مشفق کے مشورہ کو ٹھکراتا ہے، وہ اس مشفق کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو کسی کھڈ میں گراتا ہے۔

ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے اُن کے روگ کو بڑھا دیا[13]، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد[14] پیدا نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنیوالے لوگ ہیں ۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنیوالے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ[15] ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں ۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں[16] کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، ہم تو اُن لوگوں سے محض مذاق کرتے ہیں ۔ اللہ اُن سے مذاق کر[17] رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیئے جا رہا ہے، بھٹکتے پھر رہے ہیں ۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت

---

[13] دلوں کے روگ سے مراد یہود کا مسلمانوں پر یہ حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دی اسلام اور اسکی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے حسد کے اسباب میں اور اضافہ کر دیا۔

[14] فساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظامِ حق کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے۔ خواہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔

[15] اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نبیؐ پر ایمان لائے تھے۔

[16] لفظ "شیطان" کے معنی جلد باز، تند خو، مشتعل مزاج اور شریر و سرکش کے آتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ ان خصوصیات کے حامل یہود کے سرداروں کیلئے استعمال ہوا ہے۔

[17] اللہ تعالیٰ کے مذاق کی وضاحت یمدھم فی طغیانھم کے الفاظ کر رہے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کر رہا ہے تاکہ جب ان کو پکڑے تو اُن کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے[۱۸] ۝ ۱۶
ان لوگوں کی مثال[۱۹] ایسی ہے جیسے ایک شخص نے لوگوں کے لیے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے ۝ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں[۲۰] ۝ ۱۸
یا ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی ہو، کڑک ہو اور چمک ہو۔ یہ کڑکے کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہوں[۲۱]۔ حالانکہ اللہ کافروں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے ۝

---

۱۸ لہ یعنی انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں ضلالت خریدی اور اس کو بڑا نفع بخش مال سمجھا لیکن یہ مال ان کے لیے نہ دنیا میں نفع بخشنے والا ہے نہ آخرت میں۔

۱۹ لہ یہ مذکورہ مخالفِ اسلام گروہوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے۔ تمثیل میں صورتِ واقعہ کو صورتِ واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے اس لیے اس میں اجزاء کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔

۲۰ لہ یہ تمثیل ایک قافلہ کی ہے جس کے تمام افراد بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، مزید برآں رات اندھیری ہے اور اس اندھیری رات میں یہ قافلہ بھٹک رہا ہے۔ نہ یہ کسی کی سنتا ہے، نہ کسی کو پکار سکتا ہے اور نہ کسی نشان یا روشنی سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تمثیل یہود کے اس گروہ پر منطبق ہو رہی ہے جس کا ذکر آیات ۶، ۷ میں ہوا ہے۔

۲۱ لہ یہ تمثیل یہود کے دوسرے گروہ کی ہے جس کا ذکر آیت ۸ سے شروع ہوتا ہے۔ اس تمثیل میں بارش سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ ظلمات سے اشارہ ان مشکلاتِ راہ کی طرف ہے جن سے قرآن کی دعوت قبول کرنے والے دوچار ہو رہے تھے۔ رعد و برق سے مراد قرآن کی وہ دھمکیاں ہیں جو وہ اپنے جھٹلانے والوں کو دے رہا تھا۔ یہود نے ان دھمکیوں کا علاج یہ سوچا کہ ان کی طرف سے کان بند کر لیں۔

بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی ہو۔ جب جب چمک جاتی ہو یہ چل پڑتے ہوں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہو رک جاتے ہوں[۲۲]۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب[۲۳] کر لیتا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ ۲۰
اے لوگو[۲۴]! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے[۲۵] ہیں۔ تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو ۝ اس کی بندگی جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری روزی کے لیے[۲۶]۔ تو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درآنحالیکہ تم جانتے ہو ۝ ۲۲
اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے۔ تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو ۝

---

۲۲ لہ یہ اس حیرانی و پریشانی کی تصویر ہے جس میں یہود مبتلا ہو گئے تھے۔ قرآن کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرنے والی تھی اور اس کی برقِ خاطف سے ان کے لیے بچنا ممکن نہ رہ گیا تھا۔ وہ حیران و درماندہ تھے کہ کیا کریں۔

۲۳ لہ یہ وعید ہے کہ اگر اس گروہ نے قبولیتِ حق کی صلاحیت سے فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ حق سے فرار کی تدبیروں میں مشغول رہا تو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کی یہ صلاحیت بھی سلب ہو جائے گی۔

۲۴ لہ یہاں خطاب کا اصل رخ مشرکینِ عرب کی طرف ہے۔ ان کو دعوت دی گئی ہے کہ یہود کی سازشوں اور وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہو کر قرآن کی نعمت کی ناقدری نہ کریں۔ ورنہ اس سے محروم رہ کر وہ بڑی سخت سزا پائیں گے۔

۲۵ لہ یہ اشارہ ہے مشرکینِ عرب کے ان بزرگوں کی طرف جن میں سے بعض کو انہوں نے خدائی صفات میں شریک قرار دے کر خالق کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

۲۶ لہ اس آیت میں کائنات کے ان تصرفات کو بیان کیا ہے جن سے خدا کی توحید ثابت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ اگر اس کائنات میں کئی ارادے کارفرما ہوتے تو ان میں یہ موافقت اور سازگاری کیسے پیدا ہو سکتی تھی کہ آسمان اور زمین دونوں مل کر ایک گہوارہ بنائیں اور اس گہوارے میں انسان کی اس طرح پرورش کریں جس طرح ماں بچے کی پرورش کرتی ہے۔

۲۷ لہ یعنی اگر تنہا اپنے بل بوتے پر ایک سورہ تیار کرنا مشکل ہو تو اپنے ادیبوں، خطیبوں، شاعروں،

پس اگر تم نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر[28]
جو تیار ہے کافروں کے لیے ۝ اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے
نیک کام کئے اس بات کی کہ ان کیلئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں
گی۔ جب جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے، یہ وہی ہے جو اس سے پہلے
ہیں عطا ہوا تھا[29]۔ اور ملے گا انہیں اس سے ملتا جلتا اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں
گی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۝ ۲۵

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے
بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے انکے
رب کی جانب سے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے
سے اللہ کا کیا منشا[30] ہے؟ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور بہتوں کو ہدایت دیتا
ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں ۝

---

[28] اس آگ کے مرغوب ایندھن اوّل تو وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر کفر اور شرک کا مواد موجود ہوگا۔ اور دوسرے وہ پتھر ہوں گے جو معبود کی حیثیت سے دنیا میں پوجے گئے۔ یہ کفر کی توہین کے لیے آگ میں پھینکے جائیں گے۔ (انبیاء ۹۸)

[29] جنت کی نعمتیں جب اہلِ جنت کے سامنے پیش کی جائیں گی تو وہ ہر نعمت پر خوشی سے باغ باغ ہوں گے کہ الحمدللہ قرآن کی بدولت اس جنت اور اس کی نعمتوں کی سیر یں دنیا ہی میں کرا دی گئی تھی۔

[30] اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے۔ علم و معرفت کے قدردان ان تمثیلوں کی قدر کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کفار ان تمثیلات کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہاں ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ جنت اور اس کی نعمتوں کا جو ذکر ہوا ہے یہ بہرحال بشکلِ تمثیل ہے تاکہ حقیقت تمہارے ذہن نشین ہو سکے۔ اس علم کی قدر کرو اور اس پر معترض ہو کر گمراہی میں نہ پڑو۔

جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا
حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں[31]۔ اور زمین میں فساد مچاتے ہیں[32]۔ یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے
والے ہیں ۝ ۲۷

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے[33] ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا۔
پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے[34] ۝
وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ کی
اور سات آسمان استوار کر دیئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے[35] ۝ ۲۹

---

[31] اس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ تمدن اور معاشرے کی صلاح و فلاح کے پہلو سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ جس نے اس کو کاٹا گویا اس نے تمدن اور معاشرے کی جڑ ہی پر کلہاڑا رکھ دیا۔

[32] دیکھئے حاشیہ [31]۔ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور رشتۂ رحم کے احترام کی پابندیوں سے جو شخص آزاد ہوا اس کا ہر اقدام فساد فی الارض کا موجب ہوگا۔ کیونکہ اسلام نے تمام صلاح و فلاح اور تمدن و معاشرت کی بنیاد انہی دو چیزوں پر رکھی ہے۔

[33] اللہ کا وہ ماننا بھی اس کے انکار میں آتا ہے جو اس کی حقیقی صفات مثلاً وحدانیت، قدرت اور علم وغیرہ کی نفی کے ساتھ ہو۔ اس لیے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن ماننے والے درحقیقت خدا کے منکر ہیں۔

[34] یہ قیامت کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ خدا نے تم کو عدم سے وجود بخشا اور وہی تم کو زندگی کے بعد موت دیتا ہے تو آخر اس کیلئے تمہارے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا کیوں ناممکن ہو جائے گا؟

[35] اس آیت میں قیامت کی ضرورت بیان کی ہے کہ جس خدا نے تمہاری پرورش کے لیے یہ جہان بنایا اور اپنی پروردگاری کی شانیں دکھائیں جس کی قدرت اور حکمت کی شہادت کائنات کے ذرہ ذرہ سے مل رہی ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تم کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دے اور تمہارے نیکوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہ کرے۔

خالد مسعود

حدیثِ جبریلؑ

عن یحیی بن یعمر قال کان اول من قال فی القدر بالبصرۃ معبد الجہنی فانطلقت انا وحمید بن عبد الرحمن الحمیری حاجّین او معتمرین فقلنا لولقینا احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسألناہ عما یقول ھؤلاء فی القدر فوفق لنا عبد اللہ بن عمر بن الخطاب داخلاً المسجد فاکتنفتہ انا وصاحبی احدنا عن یمینہ والآخر عن شمالہ فظننت ان صاحبی سیکل الکلام الیّ فقلت ابا عبد الرحمن إنہ قد ظھر قبلنا ناس یقرؤن القراٰن ویتقفرون العلم وذکر من شانھم وانھم یزعمون ان لا قدر وان الامر انف قال فاذا لقیت اولئک فاخبرھم انّی بریءٌ منھم وانھم برآء منی والذی یحلف بہ عبد اللہ بن عمر لو ان لاحدھم مثل احد ذھبا فانفقہ ما قبل اللہ منہ حتّی یؤمن بالقدر ثم قال حدثنی ابی عمر بن الخطاب قال بینما نحن عند رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر لا یری علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد حتی جلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ ووضع کفیہ علی فخذیہ وقال یا محمد اخبرنی عن الاسلام فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاسلام ان تشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ وتقیم الصلاۃ وتؤتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا قال صدقت قال فعجبنا لہ یسالہ ویصدقہ قال فاخبرنی عن الایمان قال ان تؤمن باللہ وملائکتہ

وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ قال صدقت قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک قال فاخبرنی عن الساعۃ قال ما المسئول عنھا باعلم من السائل قال فاخبرنی عن امارتھا قال ان تلد الامۃ ربّتھا وان تری الحفاۃ العراۃ العالۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان قال ثم انطلق فلبثت ملیاً ثم قال لی یا عمر أتدری من السائل قلت اللہ ورسولہ اعلم قال فانہ جبریل اتاکم یعلمکم دینکم۔

ترجمہ: یحیی بن یعمر سے روایت ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کا انکار کیا وہ معبد الجہنی تھا۔ میں اور حمید بن عبد الرحمان الحمیری حج یا عمرہ کے لیے چلے تو ہم نے باہم یہ مشورہ کیا کہ اگر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی صاحب مل گئے تو اُن سے تقدیر کے متعلق لوگوں کے خیالات کے بارے میں دریافت کرنا مناسب رہے گا۔ چنانچہ جب ہمیں عبد اللہ بن عمرؓ مسجد میں داخل ہوتے نظر آئے تو میں نے اور میرے ساتھی نے انہیں دائیں بائیں سے گھیر لیا۔ مجھے گمان ہوا کہ میرا ساتھی چاہتا ہے کہ بات میں کروں اس لیے میں نے کہا: "ابو عبد الرحمٰن! ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے لیکن اس کے علم سے دھینگا مشتی کرتے ہیں۔" میں نے ان کے مزید حالات سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر کچھ نہیں اور ہر معاملہ بالکل آغاز سے واقع ہوتا ہے۔ عبد اللہ بن عمرؓ نے کہا۔ "جب تم ان لوگوں سے ملو تو انہیں بتا دو کہ نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے نام کی عبد اللہ بن عمر قسم کھاتا ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاس کوہِ احد کی مانند سونا ہو اور وہ اسے (خدا کی راہ میں) خرچ بھی کر دے تو اللہ اس کی یہ عبادت اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ رکھتا ہوگا۔" پھر انہوں نے حدیث بیان کی کہ:

"میرے والد عمر بن الخطابؓ نے مجھے بتایا کہ ایک دن جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے ناگاہ ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کے کپڑے بالکل سفید اور بال گہرے کالے رنگ کے تھے۔ اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ وہ سیدھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنے گھٹنے حضورؐ کے گھٹنوں کے ساتھ جا ٹیکے اور ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لیے اور کہنے لگا: "محمدؐ! مجھے اسلام کے بارے میں بتلائیے۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور

محمدؐ اللہ کے رسُول ہیں، تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو"۔ اس شخص نے کہا: "آپ نے سچ کہا"۔ عمرؓ کہتے تھے کہ ہمیں اس شخص پر تعجب ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال بھی کرتا ہے اور آپؐ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس شخص نے پھر پوچھا "مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے"۔ آپ نے فرمایا۔ "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر پر یعنی اچھی اور بُری دونوں پر ایمان لائے"۔ اس شخص نے کہا کہ "آپ نے سچ کہا"۔ پھر پوچھا "مجھے احسان کی بابت بتایئے"۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے کیونکہ اگرچہ تو نے اسے نہیں دیکھا وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے"۔ اس نے کہا: "مجھے قیامت کی اطلاع دیجیے"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتا"۔ اس نے کہا۔ "مجھے اس کی نشانیاں ہی بتا دیجیے"۔ آپ نے فرمایا۔ "نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے اور تو ننگے پاؤں، ننگے بدن والے، کنگلے ریوڑ چرانے والوں کو دیکھے کہ وہ عمارتوں میں فخر کر رہے ہیں"۔ عمرؓ نے بتایا کہ پھر وہ شخص چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضورؐ مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا "عمرؓ! جانتے ہو سوال کرنے والا کون تھا؟" میں نے عرض کی۔ "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "یہ جبریل تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے"۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان باب ماجاء فی الایمان والاسلام وذکر القدر وغیرہ)

مشکل الفاظ کے معانی | **قال فی القدر**۔ ان اعتراضات کی تعبیر کے لیے آیا ہے جو تقدیر کی نفی میں کیے گیے۔ یہی مضمون دوسری روایت میں **لما تکلم معبد بما تکلم به فی شان القدر** کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے جس کا مفہوم ہے جب معبد نے تقدیر کے باب میں بعض نازیبا اعتراضات کیے۔

معبد الجھنی، قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس فرقے کا لیڈر تھا جو عام طور پر قدریہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ حدیث سے واضح ہو رہا ہے صحابہ کرامؓ کے دور میں ہی پیدا ہو گئے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ دُنیا میں ظلم و تعدی کا اس قدر دَور دَورہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا نے یہ سب کچھ پہلے سے مقدر کر دیا ہے تو وہ ظالم ٹھہرتا ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام حالات کی باگ ڈور خود انسان

کے ہاتھ میں ہے تو پھر خدا پر کوئی الزام نہیں آتا۔ گویا تقدیر کے انکار کا یہ عقیدہ خدا کی تنزیہہ کے لیے وضع کیا گیا۔

اکتنفتہ: کنف پہلو اور جانب کے معنی میں آتا ہے اور **اکتناف** پہلوؤں سے گھیر لینا کے معنی میں۔

سیکل الکلام الیّ، وہ بات کو میرے حوالے کرے گا۔ یعنی بات کرنے کا اختیار مجھے دے گا **یتقفرون العلم**: تقفرت اثرہ میں اس کے پیچھے چلا، **اقتفر العظم** اس نے ہڈی چچوڑی **یتقفرون**: موقع شاہد ہے کہ اچھے معنی میں نہیں۔ مطلب ہو گا دھینگا مشتی کرتے ہیں، بال کی کھال اتارتے ہیں۔

الامرانف: یہ قدریہ کے عقیدہ کی تعبیر ہے۔ انف معاملے کے آغاز کو کہتے ہیں۔ کأس انف اس جامؔ کو کہا جاتا ہے جس میں سے کسی نے پہلے نہ پیا ہو۔ **الامرانف** کے معنی یہ ہوں گے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ پہلے سے طے نہیں بلکہ اس کا آغاز انسان خود کرتا ہے۔

حفاۃ: حافی کی جمع ہے یعنی ننگے پاؤں والے۔

عراۃ: عاری کی جمع ہے یعنی ننگے بدن والے۔

عالۃ: عائل کی جمع ہے یعنی کنگال، محتاج۔

یتطاولون: یعنی تکبّر کے اظہار کے لیے گردن اٹھا کر اکڑتے ہیں۔

روایت کے دوسرے طرق | یہ روایت سنن ابی داؤد میں بھی آئی ہے اور ان اہم روایات میں سے ایک ہے جن میں دین کی تعبیر بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور اس کی اساسات سمو دی گئی ہیں۔ اس میں جبریل علیہ السلام کی آمد کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کی روایت حضرت ابوہریرہؓ نے بھی کی ہے۔ اسے امام مسلمؒ نے باب الایمان ماہو اور باب الاسلام ماہو میں لیا ہے اور یہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایتوں میں جو فرق ہے وہ صرف تفصیلات میں ہے نفس واقعہ میں نہیں ہے۔ اول الذکر میں صورتِ حال کا باریک مشاہدہ ہے، سائل کی ہیئت کی تفصیل ہے اور اس کے سوال و جواب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے ذاتی تاثرات بھی بیان ہو گئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ امور تو راوی کی گرفت میں نہیں آئے

البتہ بعض اضافے ایسے ہیں جو فہم حدیث میں مدد دیتے ہیں۔

اولاً اس میں جبریلؑ کی آمد کی تقریب یہ بتائی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو دین کے بابت سوال کرنے کا موقع دیا تو وہ کچھ پوچھنے سے ہچکچائے۔ اس پر جبریل امینؑ ایک اجنبی شخص کی ہیئت میں آکر سوالات پوچھنے لگے۔ صحابہ کرام کی ہچکچاہٹ کا سبب یہ رہا ہوگا کہ انہیں آیت لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم (مائدہ - ۱۰۱) (ایسے امور کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دیئے جائیں تو تمہیں برے لگیں) کے ذریعے بعض قسم کے سوالات سے روک دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بالعموم سوالات کرتے رہنے سے محتاط ہو گئے تھے۔

ثانیاً ابو حیانؒ کے واسطہ سے روایت میں جبریلؑ کا پہلا سوال ایمان کے بارے میں نقل ہوا ہے اور دوسرا اسلام کے بارے میں۔ اس ترتیب کا صحیح ہونا قرین قیاس ہے کیونکہ ایمان دین کی نظری بنیاد اور اسلام اس کی عملی بنیاد ہے۔ نظری بنیاد کو عملی تقاضوں سے پہلے واضح ہونا چاہیئے۔

ثالثاً اس میں بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے جب قیامت آنے کے وقت سے لاعلمی کا اظہار فرمایا تو یہ بھی فرمایا کہ وقوع قیامت کا تعلق علمِ غیب سے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ آپ نے سورہ لقمان کی آخری آیت ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غداً وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیرہ (قیامت کا علم اللہ کو ہے، وہ بارش برساتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر مرے گا۔ بلاشبہ اللہ علم و خبر رکھنے والا ہے) سے استشہاد بھی فرمایا۔ یہ اضافہ قرین قیاس ہے کیونکہ حضورؐ اپنے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے معلمِ قرآن تھے اور سائلوں کی تربیت کی خاطر جوابات میں آیاتِ قرآنی کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ حضورؐ کی یہ عادت مبارکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ نیز ابو ہریرہؓ کی روایت میں علاماتِ قیامت نسبتاً زیادہ واضح ہیں۔

رابعاً اس سے پتہ چلتا ہے کہ سائل کے چلے جانے کے بعد حضورؐ نے حاضرینِ مجلس سے کہا کہ وہ اسے واپس بلائیں۔ صحابہ جب باہر گئے تو انہیں سائل کے آثار کہیں دکھائی نہ دیے۔ حضورؐ کے

اس حکم کی مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ مجلس بچشم خود اس بات کا مشاہدہ کریں جو حضورؐ فرمانے والے تھے یعنی یہ کہ سائل جبریلِ امینؑ تھے جو مجلس سے اٹھنے کے بعد اپنی اصل ہیئت میں لوٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

صحیح بخاری کی روایت میں ایمان کے ذیل میں کتاب پر ایمان کا ذکر نہیں اور الحفاۃ العراۃ رؤس الناس کا جملہ بھی نقل نہیں ہوا۔ صحیح مسلم کی روایت اس سے زیادہ جامع ہے۔

وضاحتِ حدیث | مذکورہ صدر روایت کا ابتدائی حصہ راوی کے اس بیان پر مشتمل ہے کہ ان کی اس حدیث تک رسائی کی تقریب کیا ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ بصرہ میں معبد الجہنی کا اٹھایا ہوا فتنہ قدریہ کی شکل میں پھیلنے لگا۔ یہ لوگ تقدیر کا انکار کرتے تھے۔ بعض لوگ ان کے پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگے کہ مسلمان ہونے کے لیے تقدیر پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس صورتِ حال میں صحیح الفکر مسلمانوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ انہوں نے معاملہ کو چند دانشوروں کی جدت پسندی پر محمول کر کے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں سمجھا بلکہ ان کے اندر اہلِ علم صحابہؓ کی طرف رجوع کرنے کی خواہش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس خواہش کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ صحابہ کرامؓ چونکہ گلشنِ نبوت کے خوشہ چین ہیں اس لیے ان کی رائے فکرِ نبویؐ کی غماز ہوگی۔ اور ایک مسلمان کے لیے وہی سرمایۂ ہدایت ہے۔ چنانچہ راوی — یحییٰ بن یعمر — اور ان کے ایک دوست — حمید بن عبدالرحمٰن الحمیری — جب مکہ کے سفر پر روانہ ہونے لگے تو انہوں نے اپنے قیامِ مکہ کے دوران اس مسئلہ کی تحقیق کا بھی عزم کر لیا۔ چنانچہ وہاں اتفاقاً ان کی ملاقات حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ہو گئی۔ دونوں ساتھیوں نے تمام صورتِ حال ان کے سامنے پیش کی۔ حضرت ابن عمرؓ نے قدریہ کے عقیدہ سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس سے سخت بیزاری کا اظہار کیا اور اس کی تردید میں ایک حدیث سنائی جو انہوں نے اپنے والدِ محترم حضرت عمر فاروقؓ سے سنی تھی اور جس میں اجزائے ایمان میں تقدیر پر ایمان کا ذکر بھی موجود ہے۔ گویا انہوں نے اس حدیث سے واضح کیا کہ ایمان بالقدر کا ضروری ہونا خود حضورؐ کے فرمان سے ثابت ہے لہٰذا کوئی مسلمان اسے غیر ضروری قرار دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

روایت کا دوسرا حصہ اصل حدیث پر مشتمل ہے۔ اسمیں حضرت عمرؓ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریل امینؑ ایک اجنبی کے روپ میں صحابہؓ کی مجلس میں اس حال میں پہنچے کہ ان کا لباس

صاف ستھرا تھا اور ان پر سفر کا کوئی گرد وغبار نہ تھا۔ وہ آکر ایک مؤدب شاگرد کی طرح حضورؐ کے سامنے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گئے اور پے در پے دین کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ حضورؐ ان کے نہایت جامع جواب دیتے اور یہ بات حاضرینِ مجلس کے لیے حیرت کا باعث ہوئی کہ یہ اجنبی حضورؐ کے جوابات کی تصویب بھی کرتے جا رہے تھے۔ جب وہ فارغ ہو کر مجلس سے اُٹھ گئے تو حضورؐ نے انکشاف فرمایا کہ یہ جبریلؑ تھے جو اُمت کی تعلیم کی غرض سے بعض اہم دینی اُمور کے بارے میں سوالات کرنے آئے تھے۔

جبریلؑ کے تین ابتدائی سوالات اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں ہیں۔ اسلام دین کے عملی مطالبات اور ایمان اس کی فلسفیانہ بنیادوں کی تعبیر ہے اور احسان اس میں ترقی درجات حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ گویا ایمان دین کی بنیاد ہے، اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے وہ اسلام ہے اور اس عمارت کو رفعت اور شان وشوکت احسان سے حاصل ہوتی ہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ چونکہ ایمان وہ اساس فراہم کرتا ہے جس پر اسلام کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اس لیے جبریلؑ کا پہلا سوال ایمان کے بارے میں ہوتا اور دوسرا اسلام کے بارے میں۔ ہمارے نزدیک اصل میں سوالوں کی یہی ترتیب رہی ہوگی۔ اس کی تائید ابوہریرہؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے جسے امام مسلمؒ نے باب الایمان ماہو وبیان خصالہ میں بیان کیا ہے۔

اسلام | اس حدیث میں جبریلِ امینؑ کا پہلا سوال یہ نقل ہوا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یوں تو اسلام کا لفظ خدا کی مرضی کے آگے اپنے آپ کو ڈال دینے اور حوالے کر دینے کے لیے آتا ہے اور اسلام کی رُوح بھی کامل سپردگی اور کامل حوالگی ہی ہے لیکن حضورؐ نے یہ جواب نہیں دیا۔ اصل میں سوال نقل کرنے میں عموماً اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ جواب دینے والا شخص چونکہ سائل کے سوال کو پیشِ نظر رکھ کر ہی جواب دیتا ہے اس لیے سوال کا اصل رُخ جواب ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں حضورؐ کے جواب کو مدِنظر رکھا جائے تو جبریلؑ کا اصل سوال یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کے اختیار کرنے کے عملی تقاضے کیا ہیں؟ اس کا جواب حضورؐ نے یہ دیا کہ سب سے پہلے آدمی یہ اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یہ وہ شہادت یعنی حلف ہے جس کے نتیجہ میں بندہ خدا کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی بنیاد تسلیم

کر کے اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتا اور دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو ممیز کر لیتا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے عبادات کا ذکر فرمایا جو اقرارِ توحید کے عہد کی بنیادی دفعات ہیں اور جن پر دینِ اسلام کا نظام قائم ہے یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ عبادات تعلق باللہ کی اساس ہیں اور حقوق العباد سے عہدہ برآ ہونے اور احکامِ شریعت پر عمل کرنے کی تربیت مہیا کرتی ہیں۔

اقرارِ توحید کے عہد کی پہلی دفعہ کی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔ یہ تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ، سب کی کلید اور احکامِ خداوندی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سے بندہ خدا کا قرب حاصل کرتا — اور دین کی راہ پر چلنے کی قوت پاتا ہے۔ یہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا عملاً اظہار ہے۔

زکوٰۃ ان تمام احکام کا منبع ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ یہ بخالت اور حُبِّ مال پر ضرب لگا کر آدمی کے اندر خدا کے بندوں کے لیے ہمدردی اور مؤاخات کے جذبات پیدا کرتی ہے جن کے نتیجہ میں وہ ان کے حقوق ادا کرنے میں فراخ دل ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ سے خدا کی راہ میں سب کچھ تج دینے کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے اور بندہ دین کی راہ میں عالی حوصلگی کا ثبوت دیتا ہے۔

روزہ وحج نظامِ دین میں تقویٰ کی تربیت کی عبادتیں ہیں اور تقویٰ تمام احکامِ شریعت کی بنیاد ہے۔ اس تقویٰ سے خدا کے آگے اعمال کی جوابدہی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور بندہ اپنے ہر قول وفعل کو حق وباطل کی میزان پر پرکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ایمان | جبریلِ امینؑ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ایمان کیا ہے؟ ایمان کے اصل معنی یقین، اعتماد اور اعتقاد کے ہیں لیکن یہاں بھی سوال کی نوعیت حضورؐ کے جواب سے سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی جبریلؑ نے یہ پوچھا کہ ایمان کن باتوں پر لانا ضروری ہے؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی اور بُری دونوں طرح کی تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد میں قرآن مجید ہی کی بیان کردہ اساسات بیان ہوئی ہیں۔ وہاں آیا ہے: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ - ۱۷۷) (وفاداری ان کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائیں) اس ایمان سے پہلوتہی کو بڑے دور کی گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء - ۱۳۶) (جس شخص نے اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یومِ آخرت کا انکار کیا وہ دُور کی گمراہی میں بھٹک گیا)

اس جواب میں دین کی عقائدی اور فلسفیانہ بنیادوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو یہ یقین ہو کہ تنہا وہی ہمارا اور ہر چیز کا خالق، مالک، آقا اور رب ہے، اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں اور صرف وہی یہ حق رکھتا ہے کہ بندہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہ مانے کہ فرشتے خدا کی اطاعت شعار مخلوق ہیں جو اس کی اطاعت سے سرِمو انحراف نہیں کرتے۔ وہ معصوم، امین اور خدا کے معتمد کارکن ہیں جو احکامِ الٰہی کی تنفیذ کا ذریعہ بنتے اور انسانوں کے پاس اللہ کی ہدایت لاتے ہیں۔ کتابوں پر ایمان یہ ہے کہ یہ مانے کہ تمام کتابیں اللہ کی جانب سے نازل ہوئیں اور یہ صحفِ ہدایت اور واجب الاتباع ہیں۔ ان میں قرآن مجید چونکہ آخری اور محفوظ کتابِ الٰہی ہے اس لیے یہ حق و باطل کی کسوٹی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی موجبِ فلاح ہے۔ رسولوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تمام رسولوں کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لیے اسوہ قرار دے، ان کی اتباع، اطاعت اور محبت کو لازم جانے اور رسولوں کے مابین کوئی تفریق نہ کرے۔ یومِ آخرت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مرنے کے بعد حاصل ہونے والی نئی زندگی کو شدنی مانے، اپنے ہر قول و فعل کا خدا کے سامنے اپنے آپ کو جواب دِہ سمجھے اور خدا کے بے لاگ انصاف پر یقین رکھے کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور بدوں کو ان کی برائی کی سزا دے گا اور اس کے فیصلے کے نفاذ میں کوئی طاقت حائل نہ ہو سکے گی۔ ایمان بالقدر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اس امر کا یقین رکھے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں جس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے وہ خیر ہوں یا شر وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا مقدر ہے۔ زندگی اور موت، بیماری اور صحت، رزق کی تنگی اور فراخی، عزت و ذلت وغیرہ ہر فرد کے لیے پہلے سے طے ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیات میں اجزائے ایمان میں ایمان بالقدر کو شمار نہیں کیا گیا، اس لیے حدیث میں اس کا مستقل ذکر قرآن پر ایک اضافہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر پر ایمان، اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ہی کی ایک فرع ہے۔

قرآن مجید کی رُو سے ہر فردِ انسانی کو دُنیا کی جو زندگی ملی ہے وہ اس کے رویّہ اور عمل کو جانچنے کے لیے ملی ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک خاص مدّت کے لیے ایک امتحان میں ڈالا جاتا ہے جس میں اس کی کارکردگی کا نتیجہ قیامت کے روز اس کے سامنے آئے گا۔ یہ امتحان بعض احوال ہی سے عبارت ہے جن میں ہر انسان پیدا ہوتے ہی اپنے آپ کو پاتا ہے اور جو اس کے مالک کے تجویز کردہ ہیں۔ ان احوال کو بدلنے پر کوئی شخص قادر نہیں۔ اگر بدلنا ممکن ہوتا تو بندہ خدا کی طاقت کی نفی کر کے اپنے آپ کو اس امتحان سے نکال لیتا اور یوں مقصدِ حیات کالعدم ہو جاتا۔ لہٰذا تقدیر کا انکار خدا اور بندے کے مابین تعلق کا انکار اور اس اساس ہی پر ضرب ہے جس پر دُنیا و آخرت کا نظام قائم ہے۔

احسان

جبریل امینؑ کا تیسرا سوال احسان سے متعلق ہے۔ احسان کا لفظی مفہوم کسی کام کو بہتر سے بہتر طریقہ پر سرانجام دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند وہ دینداری ہے جس میں احسان پایا جائے، یعنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا جائے۔ فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ[1] (اس شخص سے اچھا دین کس کا ہے جو اپنا چہرہ اللہ کے آگے جھکا دے جب کہ وہ خوب کار بھی ہو) حدیث میں جبریلؑ کا سوال اصلاً یہ ہے کہ یہ احسان کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت اس احساس کے ساتھ کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ چونکہ کسی کو ذاتِ باری تعالیٰ کا حسی مشاہدہ نہیں ہوتا اس لیے حضورؐ نے ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ اگرچہ تم نے اللہ کو نہیں دیکھا، جب بھی وہ تو تمہیں دیکھتا ہے۔ یعنی اللہ کو دیکھنے کا احساس پیدا کرنے کے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ وہ ہمارے اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

اللہ کی عبادت کا تقاضا اس کی اطاعت بھی ہے۔ اس لیے حضورؐ کا یہ فرمان اہلِ دین کے رفعِ درجات کے لیے بڑی وسیع جولان گاہ فراہم کرتا ہے۔ ایک بندہ خدا کی بندگی میں مشغول ہو یا اس کی شریعت پر عمل کر رہا ہو، دونوں صورتوں میں اس کو یہ احساس ہو کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے تو اس کا کام اعلیٰ ترین معیار پر سرانجام پائے گا اور اللہ کے ہاں مقبول ہو کر کرنے والے کی مقبولیت کا باعث ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ بہترین عمل کے لیے یہ احساس ضروری کیوں ہے؟ تو اس کا جواب خود حضورؐ کے الفاظ میں موجود ہے۔ عبادت اللہ اور بندے کے درمیان ایک عہد کی تکمیل ہے جس میں بندہ اپنے آقا کے آگے نیازمندی اور وفاداری کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ چونکہ علیم و خبیر ہے اس لیے وہ بندے کی

[1] نساء ۱۲۵

ہر کیفیت سے واقف ہے۔ بندے کا اظہارِ عبودیت غیر مخلصانہ یا سرسری ہوگا تو وہ اپنی عبادت کا مقصد حاصل کرنے سے قاصر رہے گا۔ کیونکہ خدا اس کے دل کی بے کیفی کو جانتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے یہ لازم ہے کہ بندہ اپنی عبادت پورے خلوص واہتمام اور اس شعور کے ساتھ کرے کہ وہ مالک کو دیکھ رہا ہے تاکہ یہ عبادت خدا کی نظروں میں پسندیدہ ٹھہرے۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جب خدا کو حسی طور پر دیکھنا ممکن ہی نہیں تو عملاً یہ شعور پیدا کرنا بھی ناممکن ہے کہ بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے، اس لیے حدیث میں بیان کردہ کیفیت کا حصول ناقابلِ عمل ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کے لیے مالک کی پہچان کا ذریعہ اس کی صفات ہیں جن کا مشاہدہ اُسے زندگی میں ہر لمحہ اور ہر قدم پر ہوتا ہے اور جن کے بیان سے قرآن مجید مملو ہے۔ اگر عبادت واطاعت کے وقت بندہ ان صفاتِ الٰہیہ کو مدِ نظر رکھے جو اس سے متعلق ہیں اور ان کی مناسبت سے اپنی حیثیت کو بھی نہ بھولے تو اس کی عبادت واطاعت خدا کو دیکھ کر سرانجام پائے گی۔

مثال کے طور پر نماز روزہ کی ادائیگی کے وقت خدا کی فرماں روائی، الوہیت، علم وخبر وغیرہ کی صفات ذہن میں مستحضر ہوں۔ انفاق کرتے وقت یہ شعور ہو کہ رزق کی کشائش یا تنگی، عزت وذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی غنی اور سب کا رب ہے۔ کمزوروں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت یہ احساس ہو کہ اصل طاقت اللہ کی ہے وہ عزیز وجبار ہے۔ احکامِ شریعت پر عمل کرتے وقت خدا کا شدید العقاب (سزا دینے میں سخت) ہونا ذہن سے اوجھل نہ ہو۔ علیٰ ہٰذا القیاس جب ہر اطاعت خدا کی ان صفات کو مستحضر کرکے کی جائے جو اس سے متعلق ہوں تو بندے کے قلب کو صحیح رُخ حاصل ہوگا۔ یہ عبادت واطاعت خدا کو دیکھ کر سرانجام پائے گی اور بندہ اسے اس طرح پورا کر سکے گا جیسا کہ اس کا مالک اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سے کمتر احساس یہ ہے کہ بندہ ہر عمل کے وقت یہ جانتا ہو کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

قیامت جبریل کا اگلا سوال یہ ہے کہ قیامت کب واقع ہوگی؟ اس کا جواب حضورؐ نے ٹھیک وہی دیا جس کی قرآن مجید میں آپ کو تعلیم دی گئی تھی۔ قرآن میں ہے: يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ (احزاب ۶۳) (لوگ تم سے قیامت کی بابت پوچھتے ہیں کہو اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے) آپؐ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں مَیں بھی اتنا ہی بے خبر ہوں جتنا

سائل ہے۔ یعنی اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ سائل کے مطالبہ پر آپؐ نے فرمایا کہ میں اس کی بعض علامات سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں۔ علامات یہ ہوں گی کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی، ننگے بدن اور ننگے پاؤں والے کنگال چرواہے عمارتوں میں فخر سے رہا کریں گے۔ یہ علامات جب ظاہر ہونے لگیں تو سمجھنا کہ قیامت قریب ہے۔

ان علامات کے ذریعے جس حقیقت کی تعبیر کی گئی ہے اس تک پہنچنا آسان نہیں۔ مستقبل کے واقعات وکیفیات اور قربِ قیامت کے فتنوں کی خبر متعدد احادیث میں دی گئی ہے۔ اس طرح کی احادیث کو مختلف ادوار میں مختلف احوال پر چسپاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس سے اختلافِ تاویل پیدا ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک ان احادیث کی حیثیت بالکل وہی ہے جو قرآنِ مجید کی آیاتِ متشابہات کی ہے جن کے بارے میں فرمایا ہے لَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ (اس کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اس لیے اصولی طور پر یہ مانتے ہوئے کہ مستقبل کے ان واقعات کی حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے اپنی جستجو اسی حد تک محدود رکھنی چاہیے جہاں تک الفاظِ حدیث یا نظائرِ حدیث رہنمائی دیتے ہوں۔

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے یہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں قدرے وضاحت سے یوں آئے ہوں: اذا ولدت الامة ربها فذالك من اشراطها و اذا كانت العراة الحفاة رؤس الناس فذالك من اشراطها و اذا تطاول رعاء البهم في البنيان فذالك من اشراطها (جب لونڈی اپنے آقا کو جنم دینے لگے تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی۔ جب ننگے بدن اور ننگے پاؤں والے لوگوں کے سردار بن جائیں تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی اور جب بھیڑ بکریوں کے چرواہے عمارتوں میں اکڑنے لگیں تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی) ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: اذا رايت الحفاة العراة الصم البكم ملوك الارض فذالك من اشراطها (جب تو ننگے پاؤں ننگے بدن والے بہرے گونگے لوگوں کو زمین کا بادشاہ بنے دیکھے تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی) اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین علامات بیان فرمائیں جن کو حضرت عمرؓ کی روایت میں ایک حد تک یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان علامات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی علامت نظامِ عائلی کے

فسادسے متعلق ہے جس میں اولاد اور والدین کے باہمی حقوق تلف ہوں گے، دوسری نظامِ سیاسی کے فسادسے متعلق ہے جس میں غیر مہذب پست ذہنیت کے نااہل لوگ بنی نوع انسان کے سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں گے اور ان کے ہاتھ میں دنیا کی زمامِ کار آ جائے گی، تیسری نظامِ معیشت میں ایک انقلاب سے متعلق ہے جس کے نتیجہ میں چرواہے محلات میں ٹھاٹ سے رہیں گے۔

جہاں تک نظائر کا تعلق ہے علاماتِ قیامت کا یہ مضمون ان الفاظ میں بھی آیا ہے:

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں مصروفِ گفتگو تھے کہ ایک اعرابی نے سوال کر دیا کہ قیامت کب ہوگی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گفتگو جاری رکھی تو کچھ لوگوں نے کہا آپؐ نے سن تو لیا ہے لیکن یہ سوال آپ کو ناگوار گزرا ہے۔ دوسروں نے کہا، نہیں آپؐ نے سنا ہی نہیں۔ جب حضورؐ اپنی گفتگو مکمل کر چکے تو پوچھا قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں یہاں ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ اس نے پوچھا، امانت کو ضائع کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا، جب زمامِ کار نااہلوں کے حوالے کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا"۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم)

"ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب . . . . مرد اپنی بیوی کے کہنے پر چلے اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، جب وہ دوستوں کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دور رکھے، جب مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں، قبیلے کی سربراہی اس کے فاسق شخص کے ہاتھ میں ہو، قوم کا لیڈر ان کا کمینہ آدمی بن جائے، ایک شخص کی عزت اس کے شر کے اندیشے سے کی جائے، . . . . تو اس وقت لوگ قیامت کی پے در پے نشانیوں کا انتظار کریں . . ." (ترمذی)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ دنیا کی آخری بربادی سے قبل ایک عام فساد دنیا پر مستولی ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں لوگ ایک دوسرے کے حقوق تلف کریں گے، عزّ و شرف کے اصل معیار معدوم ہو جائیں گے اور معاشرے میں شریر لوگوں کی عزت ہوگی۔ عدل و قسط اور شرافت سے عاری فساق و اراذل کے ہاتھ میں بنی نوع انسان کے معاملات کی باگ ڈور ہوگی۔ ان حالات کے بعد ایک وقت آئے گا جب فساد کا استیلا اس حد تک بڑھ جائے (باقی صفحہ ۱۲ پر)

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

تعلّق باللہ اور اُس کی اساسات

تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلق زیرِ بحث آتا ہے وہ آدمی کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہے۔ اسی تعلق کے صحیح شعور اور اسی کی صحیح معرفت سے آدمی کو دوسرے تعلقات کے صحیح حقوق و فرائض کی شناخت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارا تعلق ہماری ذات کے ساتھ کن بنیادوں پر قائم ہے۔ خاندان، قبیلہ، قوم، حکومت، اور ریاست کے ساتھ ہمارے تعلق کی اساسات کیا ہیں اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہم کن روابط کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ان تمام تعلقات کی بنیادیں اگر واضح ہو کر سامنے آ جائیں اور آدمی ہر غلط بندھن کو توڑ دے اور ہر صحیح رشتہ کو استوار کرلے تو وہ اپنے رب کا فرمانبردار بندہ، اپنے خاندان اور کنبے کا ایک لائق فرد، اپنی ریاست کا ایک خیر خواہ و وفادار شہری اور دنیا میں ایک سچا محبِ انسانیت بن جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حاصل کر کے درحقیقت ایک انسان ایک صحیح تربیت یافتہ اور ایک پاکیزہ انسان بنتا ہے اور اسی طرح کا تربیت یافتہ اور پاکیزہ انسان بنانا اس تزکیہ کا اصل مقصود ہے جس کی تعلیم حضرات انبیاء علیہم السّلام نے دی ہے۔ اگر انسان کے ان تعلقات کا کوئی گوشہ بھی ناہموار رہ جائے تو صرف یہی نہیں کہ اس گوشہ میں وہ تزکیہ کی برکت سے محروم رہتا ہے بلکہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کے دوسرے گوشوں میں بھی ناہمواریاں اور خرابیاں موجود ہیں۔

ہماری زندگی کے یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا بناؤ یا بگاڑ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے تدبر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح طور پر اس صورت میں قائم ہوتا ہے جب ہم اپنے آپ کو خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت ہمارے دل، ہماری روح اور ہمارے ارادے سے ایک خاص مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہم یہ

تمام مطالبے ٹھیک ٹھیک پورے کر دیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے رب کے ساتھ اپنے تعلق کو بالکل صحیح بنیاد پر قائم کر لیا۔ درحقیقت یہی تقاضے ہیں جن کی تفصیلات شریعت میں بیان ہوئی ہیں اور قرآن مجید میں اکثر احکام و ہدایات کے بیان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا جو حوالہ آتا ہے وہ درحقیقت اسی بات کو واضح کرنے کیلئے آتا ہے کہ یہ مطالبہ یا یہ ہدایت خدا کی فلاں صفت کا تقاضا ہے۔ جو شخص شریعت کے احکام و ہدایات پر اس شعور کے ساتھ عمل کرتا ہے کہ فلاں حکم یا فلاں ہدایت کے اندر خدا کی فلاں صفت کا جلوہ ہے، وہ شخص درحقیقت شریعت کی اصلی رُوح کو پہچانتا ہے۔ شریعت کے احکام پر جب وہ عمل کرتا ہے تو اس طرح عمل کرتا ہے کہ گویا وہ اس عمل کے اندر خدا کے جلوہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو نبیؐ نے احسان سے تعبیر فرمایا ہے یعنی یہ خدا کی بندگی اور اطاعت اس طرح کرتا ہے کہ گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ بندہ کا خدا کو دیکھنا یہی ہے کہ شریعت کے ہر حکم کے اندر خدا کی صفات کا جو عکس ہے وہ اس کو نظر آتا ہے اور جب وہ عکس اس کو نظر آتا ہے تو صاف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس حکم کے اندر خدا کی نگران آنکھیں چھپی ہوئی ہیں جو اُسے دیکھ رہی ہیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کیجئے تو آپ کو ہر حکم اور ہدایت کے ساتھ خدا کی کسی نہ کسی صفت کا حوالہ ضرور ملے گا۔ کہیں ایک بات فرمائی جائے گی اور اس کے ساتھ یہ آئے گا کہ خدا علیم و خبیر ہے۔ کہیں ایک بات کا حکم دیا جائے گا اور ارشاد ہوگا خدا علیم و حکیم ہے۔ کہیں کسی چیز سے روکا جائے گا اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ ہوگی کہ خدا قوی و عزیز ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام دین و شریعت درحقیقت خدا کی صفات کا ایک مظاہرہ ہے، آدمی اگر اپنے آپ کو پوری طرح شریعت کے رنگ میں رنگ لے تو اس نے اپنے آپ کو صبغۃ اللہ میں رنگ لیا، اور دوسری بات یہ واضح ہوتی کہ شریعت کے احکام کی پابندی کا اصلی مزا صرف اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو شریعت کے احکام کے اندر خدا کی صفات کے جمال و جلال کو دیکھ رہا ہو۔ جو لوگ اس جمال و جلال کے مشاہدے سے محروم رہتے ہیں ان کی دینداری بالکل رسمی اور رواجی دینداری ہوتی ہے۔ اس کے اندر اوّل تو پائیداری نہیں ہوتی اور پائیداری ہوتی بھی ہے تو اس کے اندر رُوح اور زندگی نہیں ہوتی۔

ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ

یہاں ایک غلط فہمی سے آگاہ کر دینا نہایت ضروری ہے، وہ یہ کہ خدا کی صفات کے تقاضوں

کے مطابق بننا اور چیز ہے اور خدا کی صفات کا مظہر بننے کی کوشش کرنا ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ شریعت انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جو جوڑتی ہے اس میں اصلی نصب العین اور مطمح نظر یہ ہے کہ بندہ اپنے ظاہر و باطن دونوں میں خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بن جائے۔ شریعت میں بندے کے لئے کمال کا سب سے بڑا درجہ یہی ہے جو اکتساب اور جدوجہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کمال کا کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے۔ لیکن وہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے، اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے یہ مرتبہ دیا ہے۔

لیکن جوگیوں اور راہبوں کے تصوف میں، بالخصوص اس تصوف میں جس کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریہ پر ہے، مطمح نظر خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا نہیں ہے بلکہ خدا کی صفات کے مظہر بننے کا ہے۔ اس میں مجاہدہ اور ریاضت کا اصل مقصود یہ نہیں ہوتا کہ آدمی عبدیت کا کمال درجہ حاصل کرے بلکہ سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی صفات کا اس طرح مظہر بن جائے کہ قطرہ دریا میں ضم ہو جائے اور دوئی اور تفرقہ کے سارے نشانات مٹ جائیں۔ ع

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

ظاہر ہے کہ یہ مطمح نظر شریعت کے مطمح نظر سے ایک بالکل مختلف مطمح نظر ہے۔ شریعت آدمی کو بندہ بنانا چاہتی ہے اور اس کا تزکیہ کا سارا جہاد اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جوگیانہ تصوف میں آدمی اپنے آپ کو الٰہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی ساری ریاضت میں یہی غلط نقطۂ نظر کارفرما ہوتا ہے۔ اگر خدا کی شان تجرد ہے تو اس راہ پر چلنے والے اپنے اندر تجرد کی شان پیدا کرنا چاہیں گے۔ اگر خدا بے نیاز ہے تو یہ حضرات بھی بے نیاز بننے کی کوشش کریں گے، اگر خدا متصرف ہے تو یہ بھی متصرف ارواح و قلوب بننے کیلئے زور لگائیں گے، اگر خدا علیم و خبیر ہے تو یہ بھی غیب کے پردوں میں جھانکنے کے لئے طرح طرح کے چلّے اور مراقبے کریں گے، اگر خدا شانِ مطلق ہے تو یہ بھی چاہیں گے کہ ان کے ہاتھ لگانے اور ان کے چھو منتر سے بھی مریض شفا پائیں اور مُردے جی اُٹھیں، اگر خدا آگ اور پانی پر حکمران ہے تو یہ بھی پانی پر چلنا اور آگ سے کھیلنا چاہیں گے۔ یہاں تک کہ اس راہ پر چلنے والے لوگ اگر شریعت کی پابندیوں کو قبول بھی کرتے ہیں تو اپنے مذکورہ بالا مطمح نظر ہی کی خدمت کے نقطۂ نظر سے قبول کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ پابندیاں اس مطمح نظر تک پہنچنے کے لیے ایک زینے اور سہارے کا کام دیتی ہیں، بالآخر ان کے ہاں ایک وہ منزل

بھی آتی ہے جہاں یہ ساری چیزیں بندھن اور حجاب کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں اور حصول کمال مطلق کی راہ میں سبک روی کے لیے ان ساری پابندیوں سے آزاد ہو جانا ان کے ہاں ضروری ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تعلق باللہ کے اس نقطۂ نظر کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ اس نے تعلق باللہ میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو صفاتِ الٰہی کے تقاضوں کے مطابق بنائے۔ مثلاً یہ کہ خدا منعم ہے تو بندہ کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کا شکر گزار بندہ بنے، خدا خالق ہے تو چاہیئے کہ بندہ اسی کے امر و حکم کی اطاعت کرے، خدا سمیع و علیم ہے تو بندہ اسی سے مانگے اور اسی پر بھروسہ کرے، خدا قدوس ہے تو بندہ کو چاہیئے کہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ بنائے، خدا عادل و طاقتور ہے تو چاہیئے کہ وہ ہر لمحہ اس سے ڈرتا رہے اور ظلم و ناانصافی کی ہر بات سے پرہیز کرے۔ غرض خدا کی ہر صفت بندے کو گوناگوں ذمہ داریوں اور بے شمار حقوق و فرائض کے بندھنوں میں باندھتی ہے۔ اور بندہ خدا کی صفات اور ان کے عائد کردہ حقوق و فرائض کے علم و عمل کی راہ میں جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی خدا سے اس کا قرب بھی بڑھتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں بھی مشکل سے مشکل تر اور نازک سے نازک تر ہوتی جاتی ہیں۔

اصل بحث سے پہلے یہاں یہ تنبیہ میں نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ جو گیانہ تصوف کے بعض غلط اثرات اس تصوف میں بھی گھس آئے ہیں جس کو مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ذہنوں میں وہ غلط فہمی بھی موجود ہو جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اگر یہ غلط فہمی موجود ہو تو آدمی پر تزکیہ کے اس نظام کی اصل قدر و قیمت واضح نہیں ہو سکتی جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے اور جس کے اصول و مبادی میں واضح کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔

تصوف پر ہمارے متقدمین نے جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کی قدر و قیمت کا میں بہت قائل ہوں۔ لیکن ان کتابوں اور ان کے لائق احترام مصنفین کے واجبی احترام کے باوجود میری دیانت داری کے ساتھ رائے یہ ہے کہ ان میں مقامات کی جو تشریح کی گئی ہے اس میں اکثر جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات کتاب و سنت کی حدود سے آگے نکل گئی ہے۔ ایک چیز کا جو اعلیٰ معیار وہ پیش کرتے ہیں اگر کتاب و سنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھیئے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ مقام کتاب و سنت کے مقام سے ایک مافوق مقام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصل معیار اس کو مان لیجئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم

بھی اس معیار پر شاید ہی پورے اتر سکیں۔ اس چیز کا اثر طبیعت پر یا تو مایوسی کی شکل میں پڑتا ہے، آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ باتیں ہمارے دائرۂ جدّ و جہد سے باہر ہیں۔ یا پھر کتاب و سنت سے اس کو یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ ان میں جو معیار پیش کیا گیا ہے، وہ صرف عام معیار ہے۔ عبدیت و انابت وغیرہ کا حقیقی معیار وہ ہے جو اہلِ تصوف پیش کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ایک مناسب ترتیب کے ساتھ میں ان اساسات کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا جن پر اللہ تعالےٰ نے پسند فرمایا کہ ہمارا تعلق اس کے ساتھ قائم ہو اور جن پر ہم اپنا تعلق اس کے ساتھ قائم کر کے اپنے آپ کو اس کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

شُکر

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی سب سے پہلی بنیاد شکر ہے۔ شکر کا تعلق دل سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں، اس کے بے نہایت احسانات اور اس کے ان گنت انعامات کے احساس و اعتراف کے جذبہ سے اس طرح لبریز رہے جس طرح ایک دودھیل بکری کا تھن دودھ سے لبریز رہتا ہے۔ یہ تمثیل میں نے محض تمثیل کے مقصد سے نہیں اختیار کی ہے بلکہ لفظ شکر کی لغوی حقیقت بھی کچھ اس سے ملتی جلتی ہے۔ دل جب اللہ تعالیٰ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے تو جس طرح ذرا سی حرکت سے ایک لبریز ساغر چھلک جایا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی یا بڑی نعمت کی یاد اور اس کے مشاہدہ سے بندے کی زبان سے شکر کا کوئی کلمہ چھلک پڑتا ہے۔

جس شخص کا دل اس طرح خدا کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہے اس کا اثر لازمی طور پر اس کے اعمال پر بھی پڑتا ہے۔ اس کو ہر وہ عمل دل سے محبوب ہو جاتا ہے جس سے اس جذبے کو تسکین حاصل ہو سکے۔ اور اسی کے برابر اس کو ہر اس عمل سے نفرت ہو جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی کسی ظاہری یا باطنی نعمت کی ناقدری ہو رہی ہو۔ کسی نعمت کی قدر کا حقیقی احساس اگر آدمی کے اندر موجود ہو تو وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نعمت کو اپنے حقیقی منعم ہی کے منشاء کے خلاف استعمال کرے۔ اگر ایک کرم فرما ہمیں ایک ٹارچ عنایت کرے کہ ہم اس کی مدد سے اندھیرے کی ٹھوکروں سے بچ سکیں۔ ایک تلوار عنایت کرے کہ دشمن کے خطرات کی مدافعت کر سکیں، ایک سواری عنایت کرے کہ پیدل چلنے

نظرِ عنایت کا جویا ہو۔

وھذا کتب انزلناہ مبارک فاتبعوہ واتقوا لعلکم ترحمون (انعام ۱۵۵)

اور یہ کتاب ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

یہ صحیفۂ ہدایت کوئی سپاٹ کتاب نہیں جس کے مندرجات کو جاننے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہ ہو۔ اوّل تو یہ اس عربی زبان میں ہے جو چودہ سو سال قبل قریش میں رائج تھی، پھر یہ اپنے وقت کی بھی اتنی معیاری عربی تھی جس کی نقل پیش کرنا ہمعصر ادیبوں کے لیے کبھی ممکن نہ ہو سکا۔ یہ زبان آج کل کے اہلِ مکہ خود بھی اب ترک کر چکے۔ چنانچہ قرآن مجید ان کے لیے بھی آسان کتاب نہیں چہ جائیکہ ہم عجمیوں کے لیے یہ تر نوالہ ہو۔ دوسرے اس میں احکام و قوانین ہیں اور احکام و قوانین کے بارے میں معلوم ہے کہ ان کی دفعات کے دروبست اور علاماتِ وقف تک کو بھی صحیح استدلال میں اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس لیے ہر زبان جاننے والا اس کے مفہوم تک آسانی سے رسائی نہیں حاصل کر سکتا۔ تیسرے اس میں سنن الٰہیہ اور متعدد مابعد الطبیعیاتی مسائل پر کلام ہے جن کی اصلیت و حقیقت سے انسان کو بلاواسطہ کوئی واقفیت نہیں۔ ان اعتبارات سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید محلِ تدبر ہے اور اس سے صحیح استفادہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ایک بندہ اس کی واقعی حیثیت کو تسلیم کر کے، اس سے ہدایت کا طالب بن کر، اس پر تفکر و تدبر کرے اور اس سے فیض یاب ہو۔ چنانچہ فرمایا:

کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب (ص ۲۹)

یہ نہایت بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور صاحبِ عقل اس سے یاد دہانی حاصل کریں۔

قرآن مجید کے زمانۂ نزول میں جن لوگوں نے اس کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اس پر تدبر نہ کیا وہ سرے سے یہ احساس ہی نہ کر سکے کہ یہ واقعی آسمانی ہدایت ہے، وہ اسے انسانی اختراع قرار دے کر اس کی اہمیت گھٹاتے رہے۔ چنانچہ قرآن مجید کو بار بار یہ انتباہ کرنا پڑا کہ وہ قرآن پر تدبر کریں تاکہ ان پر حق واضح ہو۔ فرمایا:

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (نساء ۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے! اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

افلم یدبروا القول ام جاءھم مالم یأت آباءھم الاولین (مومنون ۶۸)

کیا انہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا یہ بات ہے کہ ان کے پاس وہ چیز آئی جو ان کے اگلے آباء و اجداد کے پاس نہیں آئی۔

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اگر ایک شخص اپنے دل و دماغ کے دریچے کھول کر رکھے اور اس کتاب پر تدبر کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کی ہدایت سے محروم رہے۔ اسی لیے محرومین کی حالت پر تعجب کے انداز میں فرمایا:

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا (محمد ۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں!

اس تفصیل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا کوئی حامل اس پر تدبر کے فرض سے پہلوتہی کر کے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اس صحیفۂ ہدایت کا حق ادا کر رہا ہے۔ تدبر کا یہ فریضہ وقتی نہ تھا۔ لہٰذا قیامِ قیامت تک قرآن کے اس حق کی ادائیگی کو جاری رہنا ہے۔

خدا کی اتاری ہوئی ہدایت اور اس کو لانے والا رسول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے اوپر پہلے ایمان لانے والے، اس کے پسندیدہ عمل کو اختیار کرنے والے اور اس صحیفہ کے معلم تھے۔ آپ کا فرضِ منصبی یہ تھا کہ آپ اس کی حکمت و فلسفہ اور اس کے احکام و قوانین کو لوگوں پر واضح کریں، ان کے فکر کو مہمیز دیں تاکہ وہ وحیِ آسمانی کی تعلیمات کے حامل ہو سکیں۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون (نحل ۴۴)

اور ہم نے تم پر یہ یاددہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ آپ کے اقوال و افعال کو بھی محلِ تدبر

کی شفقت سے بچ سکیں تو کوئی انتہائی درجے کا کمینہ اور لئیم ہی ہوگا جو ان سارے اسباب و وسائل کو اسی کرم فرما کے گھر پر حملہ اور اسی کے زن و فرزند کو قتل کرنے میں استعمال کرے جس نے یہ اسباب و اسلحہ اس کو عنایت فرمائے۔ اسی طرح جس بندے کے اندر ان نعمتوں کا سچا احساس ہوتا ہے جو خدا نے اس کو عنایت کی ہیں، وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ ان نعمتوں کو وہ شیطان کی مقصد برآری میں صرف کرے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہؓ نے اپنے اس خط میں اشارہ فرمایا ہے جو امیر معاویہؓ کو لکھا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ "جس شخص پر انعام ہوا ہو اس کے اوپر کم سے کم جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس انعام کو اسی کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے جس نے وہ انعام اس پر کیا ہے۔"

اس شکر کے جذبے کو صحیح طور پر بیدار رکھنے کے لیے چند باتیں نہایت ضروری ہیں:

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آدمی کو اس کے ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ملی ہوئی ہیں ان کو برابر نگاہ میں رکھنے کی کوشش کرے۔ انسان کے اندر یہ بڑی کمزوری ہے کہ اگر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو وہ تو اس کے ذہن پر چوبیں گھنٹے مسلط رہتی ہے اور ہر کسی سے اس کا ذکر کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں جو اس کو ہر وقت حاصل ہیں ان سے وہ اس طرح غافل و بے پروا رہتا ہے گویا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر آدمی کو نعمتوں کے نعمت ہونے اور ان نعمتوں سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی احساس ہی نہ ہو تو وہ منعم کی قدر کیا کرے گا۔ اور اس کے لیے اس کے اندر شکر و سپاس کا جذبہ کیا پیدا ہوگا۔ اس غفلت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی روزانہ کوئی نہ کوئی وقت تھوڑا سا ایسا ضرور نکالے جس میں ان نعمتوں پر غور کرے جو اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہر و باطن دونوں میں بخشی ہیں بلکہ ان کے مظاہر اس کائنات کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تنہائی میں کبھی کبھی غور کرتے کرتے وہ اس پہلو سے بھی سوچے کہ بالفرض یہ نعمتیں اس کو نہ حاصل ہوتیں تو کیا ہوتا؟ یہ آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے اس سے وہ محروم ہوتا، یہ کان جس سے وہ سنتا ہے یہ بہرے ہوتے، یہ ہاتھ جن سے وہ زور آزمائی کرتا ہے شل ہوتے، یہ پاؤں جن سے وہ چلتا ہے مفلوج ہوتے تو اس کا حشر کیا ہوتا؟ اور پھر سب سے زیادہ وہ اس بات پر دھیان کرے کہ یہ دماغ جس کی کارفرمائیوں پر وہ سب سے زیادہ نازاں ہے، خدانخواستہ یہ ماؤف ہوتا تو اس کی گت کیا بنتی؟

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آدمی اس امر پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں ہمیں بخشی ہیں بلا کسی استحقاق کے بخشی ہیں۔ نہ ہمارا خدا پر کوئی حق قائم تھا نہ ہم نے کسی نعمت کا اس کو معاوضہ

ادا کیا ہے اور نہ کسی نعمت کا معاوضہ ادا کر سکتے ہیں۔ پھر وہ جب چاہے اپنی ہر نعمت کو ہم سے چھین سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آج آپ کو تخت شاہی کی عظمتیں حاصل ہیں، کل وہ آپ کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی پکڑا دے تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے کبھی بھی ذلت و مصیبت میں پڑے ہوئے آدمی کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر جانے کی کوشش نہ کیجیے بلکہ اس امر پر غور کیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسی حالت میں مبتلا کر دیتا یا آئندہ کر دے تو آپ کو اس چیز سے کون بچا سکتا یا کون بچا سکے گا۔ دنیا میں مصیبت زدہ سے مصیبت زدہ اور مفلوک سے مفلوک آدمی جو آپ نے دیکھا ہو، یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ ٹھیک اس کی جگہ پر آپ کو کھڑا کر سکتا تھا اور اس کو آپ کی جگہ دے سکتا تھا لیکن یہ اس کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپ کو اس سے نہایت بہتر حالت میں رکھا۔

تیسری ضروری بات اپنے اندر شکر گزاری کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرے، جو اپنے اسباب و وسائل اور اپنے حالات و ذرائع کے اعتبار سے اس سے بہتر حالت میں ہوں، بلکہ ان لوگوں کو بھی سامنے رکھ کر اپنا موازنہ کرتا رہے جو ہر پہلو سے اس سے فروتر زندگی رکھتے ہیں۔ جو آدمی ہمیشہ اپنے سے بہتر حالات رکھنے والوں ہی پر نگاہ رکھتا ہے وہ ہمیشہ اپنی تقدیر سے شاکی اور اپنے رب سے بدگمان رہتا ہے، اس کے دل کو سچی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس کو بہتر سے بہتر حالات بھی میسر آ جائیں جب بھی اس کا دل آسودہ نہیں ہوگا، کیونکہ یہ درجہ تو اس کو بہرحال حاصل ہونے سے رہا کہ اس آسمان کے نیچے کوئی شخص کسی اعتبار سے بھی اس سے بہتر حالت میں نہ رہے۔ اس وجہ سے خدا کی شکر گزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ آدمی ان لوگوں کے حالات پر نگاہ ڈالے جو اسی خدا کے بندے ہیں جس کا بندہ وہ ہے لیکن ان لوگوں کو ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی حاصل نہیں ہے جو اس کو بڑی وسعت کے ساتھ حاصل ہیں۔

حضرت سعدیؒ کی ایک حکایت اس حقیقت کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی سیر و سیاحت کے سلسلے میں وہ دمشق یا کسی اور شہر میں جب پہنچے تو ان کی جوتی پھٹ چکی تھی اور ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ نئی جوتی خرید سکیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی اس غربت کے سبب سے میں دل میں نہایت ملول تھا اور بار بار یہ خیال ذہن میں پیدا ہو رہا تھا کہ اس فضل و کمال کے باوجود خدا نے مجھے اس حال میں رکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتی بھی نہیں ہے۔ فرمانے (باقی صفحہ ۱۲ پر)

شعر عرب
جاوید احمد

شرح شواہدِ فراہی

فجری بالغلام شبه حریق
فی یبیس تذروہُ ریحُ الشمال

یہ شعر امام حمید الدین فراہیؒ نے اعشیٰ بکر بن وائل کے ایک قصیدے سے لیا ہے[1] اور اس سے سورہ ذاریات کی پہلی آیت کی تفسیر میں استشہاد کیا ہے۔

الفاظ کے لغوی معنی | اس شعر کی ابتدا 'ف' سے ہوئی ہے۔ یہ 'ف' 'عطف کی ہے جو مجرد ترتیب کو بیان کر رہی ہے جیسے قرآن مجید میں فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ (تو ہم نے تمھارے حجابات اٹھا دیئے) کا ٹکڑا لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ[2] (اور تم یقیناً غفلت میں تھے) کے بعد آیا ہے۔ یعنی حجابات کا اٹھا دیا جانا اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد ہوا کہ یہ دنیا کی زندگی میں غافل رہے تھے۔ اسی طرح طرفہ بن العبد کے اس شعر میں بھی 'ف' کی دلالت ترتیب پر ہی ہے۔

احلت علیها بالقطیع فاَجْزَمت
وقد خبّ آل الامعز المتوقد

یعنی اونٹنی پر کسی کا کوڑے مارتے ہوئے سوار ہونا اور اُس کا دوڑنا یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئے۔ 'جری' کے معنی یہاں دوڑنے کے ہیں اور اس کے یہ معنی اُس وقت ہوتے ہیں جب اس فعل کی نسبت کسی دوڑنے والی چیز کی طرف ہو۔ 'جری' کا یہ عمل گھوڑے کی پیٹھ پر لڑکے کو سوار کرنے کے بعد واقع ہوا۔

'فجری بالغلام' میں 'ب' فعل کو متعدی بنا رہی ہے اور 'غلام' عربی میں

---

[1] یہ شعر جس قصیدے سے لیا گیا ہے شاعر نے اُس کی ابتدا اس شعر سے کی ہے:

ما بکاء الکبیر بالاطلال [illegible] سوال

[2] سورہ ق آیت ۲۲۔

ایسے لڑکے کو کہتے ہیں جس کی مسیں بھیگ چکی ہوں یعنی جو بالغ ہونے کے قریب ہو۔ اس پر 'لام' عہد کا ہے یعنی اس سے مراد وہی غلام ہے جس کا تذکرہ پچھلے شعر[1] میں ہوا ہے۔

'الشبہ' کے معنی مانند کے ہیں اور حریق بھڑکتی ہوئی آگ کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ[2] (اور ہمارا فرمان ہے کہ تم سب بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب چکھو) مہلہل بن ربیعہ نے بھی 'حریق' کو اسی معنی میں استعمال کرتے ہوئے کہا ہے:

وقد علتهم للبقاء هبوه
ذات هیاج کلهیب الحریق

'فی یبیس تذروہ ریح الشمال' میں یبیس کے معنی ایسی خشک چیز کے ہیں جو پہلے سرسبز و شاداب ہو اور بعد میں خشک ہو گئی ہو۔ 'تذرو' 'الذرو' سے مشتق فعل ہے اور اس سے مشتق فعل کبھی لازم اور کبھی متعدی معنی میں آتا ہے البتہ اس شعر میں یہ متعدی معنی ہی میں آیا ہے۔ جب ہوا کسی چیز کو منتشر کر دے اور اڑا کر لے جائے تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے 'ذرت الریح الشیٔ' کا جملہ بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے فَاَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ[3] (اور جب (سبزہ) گھاس پھونس میں تبدیل ہو گیا تو ہوا نے اسے بکھیر کر رکھ دیا)

'تذرو' کے بعد 'ریح' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی چلتی ہوئی ہوا کے ہیں اور یہ مؤنث بولا جاتا ہے۔ شاعر نے اس کی اضافت شمال کی طرف اس لیے کی ہے کہ اُن کے ہاں یہ ہوا اپنی طوفانی خصوصیات اور ٹھنڈک کے اعتبار سے شدید ترین ہوتی تھی اور یہی سبب ہے کہ اُن کے ادب پاروں میں شمال کی جانب سے چلنے والی ہواؤں کی شدت اور تیزی کا تذکرہ متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہوا شمال کی جانب سے چلتی ہے تو اس کے ساتھ ان کے صحنوں میں خزاں ڈیرے ڈال دیتی ہے۔

---

[1] شعر کے الفاظ یہ ہیں:

فحملنا غلامنا ثم قدنا — ھاجرا لصوت غیر امراحتیال

[2] سورہ انفال آیت ۵۰۔

[3] سورہ کہف آیت ۵۰۔

موسم سرد ہوجاتا ہے۔ آسمان پر بادل کثرت سے آتے ہیں اور تیز ہوائیں کثرت سے چلتی ہیں۔ آسمان اپنے بادلوں سے برف برساتا ہے جو انتہائی سخت کوش اونٹوں کو بھی تھانوں میں بیٹھے رہنے پر مجبور کردیتی ہے۔ زمین کی روئیدگی معدوم ہوجاتی ہے۔ اس میں اُگے ہوئے درخت، پھول، سبزہ اور گھاس زرد اور خشک ہونے لگتے ہیں۔ پتے درختوں کی ٹہنیوں سے گرنے لگتے ہیں اور پھر یہ تند اور تیز ہوا انہیں اڑائے پھرتی ہے۔ عرب شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ان تمام مناظر کی تصویر کشی ملتی ہے۔ پتوں کا گرنا، شمال کی ٹھنڈی ہواؤں کا تیز چلنا، ان کا بادلوں کو اڑائے پھرنا، ان کا قحط، خشک سالی اور شدید سردی کو ساتھ لانا، اس میں اُن پر نازل ہونے والی مصیبتوں میں اُن کا سخاوت کرنا عرب شعراء کا خاص موضوعِ سخن ہے۔ ان ساری باتوں کو بیان کرنے کے لیے وہ متعدد طریقے اختیار کرتے ہیں[1]۔

شعر کی ترکیب 'فجری بالغلام شبہ حریق' میں 'جری' فعل ماضی ہے۔ فاعل ضمیر مستتر ہے جس کا مرجع گھوڑا ہے۔ 'بالغلام' میں 'ب' حرفِ جار ہے اور 'غلام' مجرور۔ یہ دونوں مفعول ہونے کے سبب حالتِ نصبی میں ہیں۔ شبہ فعل میں مستتر ضمیر سے حال واقع ہونے کے سبب منصوب ہے یا مصدر محذوف 'جریاً' کی صفت ہے۔ یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح چلنا۔ حریق مضاف الیہ ہے اس لیے یہ مجرور ہے۔

'فی یبیس تذروہ ریح الشمال' میں 'یبیس' ایک اسم محذوف یعنی کلاء کی صفت ہے اور اس کا تعلق حریق کے ساتھ متعلق حرف ہے۔ 'تذروہ' فعل مضارع ہے اس کا فاعل ریح الشمال' اور مفعول اس کے آخر میں موجود ضمیر منصوب ہے جو اسم محذوف اور اس کی صفت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ 'تذروہ ریح الشمال' کا جملہ کلاء یبیس کی صفت ہے۔

شعر میں شہادت کا پہلو امام فراہی نے اس شعر کا حوالہ یہ ثابت کرنے کے لیے دیا ہے کہ 'الذرو' ہواؤں کی صفت کے لیے معروف ہے۔ اس لیے ذاریات کی صفت موصوف کے تذکرہ کے بغیر بھی قاری کو ہواؤں کی طرف متوجہ کردیتی ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب الٰہی میں 'والذاریاتِ ذرواً' بغیر موصوف کے ہے۔

شعر کا سادہ مفہوم ہم نے اپنے لڑکے کو گھوڑے پر سوار کردیا تو وہ اُسے لے کر اس طرح دوڑا جیسے آگ سوکھی گھاس میں پھیلتی ہے جسے شمالی ہوا اُڑائے پھرتی ہو۔ (عربی سے ترجمہ: طالب محسن)

[1] شارح نے یہاں اپنے بیان کو مؤکد کرنے کے لیے حاتم، ابو قیس، الہذلی، عنترہ اور دیگر شعرائے جاہلیت کے اشعار بطور شہادت پیش کیے ہیں۔

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

جبر و اختیار کا مسئلہ

سوال: کہا گیا ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا مالک و حاکم خداوند تعالیٰ ہے تو انسان اس امتحان کے لیے کیسے آزاد ہے؟ پھر جب اللہ تعالیٰ کو ازل سے ہی سب کچھ معلوم ہے تو امتحان کے کیا معنی؟

جواب: اس ضمن میں چند چیزیں مضبوط طریقہ سے سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اس بحث کا دار و مدار تین اصولی مسئلوں پر ہے:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں پر انسان سے پرسش کرے گا اُس کا اُس نے اختیار بھی دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات عدل اور انصاف کے خلاف ہے کہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر پرسش تو ہو لیکن اس کا اختیار نہ ہو۔ یعنی پرسش لازم با اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم اتنے سال کیوں جیے، اتنے سال کیوں نہیں جیے؟ اس لیے کہ ہمیں اس معاملے میں کوئی بھی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن وہ یہ پوچھیں گے کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی، اس لیے کہ نماز کا اختیار دیا ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھیں گے کہ اتنا ہی کیوں کھایا، اتنا کیوں نہیں کھایا؟ اس لیے کہ جسم کی ضروریات انسان نے مقرر نہیں کیں۔ لیکن وہ یہ پوچھیں گے کہ حرام کیوں کھایا؟ اس لیے کہ اس معاملے میں اختیار دیا گیا ہے کہ انسان روزی جائز طریقوں سے بھی کما سکتا ہے اور حرام طریقوں سے بھی۔

دوسرے یہ کہ اگر آپ کوئی نیکی کرنے کا عزم رکھتے تھے لیکن اس کا اللہ تعالیٰ نے موقع نہیں دیا یا اس کی حکمت کے تحت اس میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوگئی تو اس نیکی کے اجر سے اللہ تعالیٰ آپ کو محروم نہیں کرے گا۔ فرض کرلیجیے کہ آپ حج کرنا چاہتے تھے، زندگی بھر چاہتے رہے لیکن کسی وجہ سے، بیماری کے باعث یا مال کی تنگی کے سبب یا کسی اور وجہ سے عملاً ایسا نہ کرپائے تو آپ کو اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں میں آیا ہے کہ کتنے لوگ ہیں کہ جو اگرچہ وسائل کی کمی کے باعث غزوہ تبوک میں شرکت کے لیے نہ جاسکے لیکن خدا کے ہاں وہ اس سفر اور غزوہ میں شریک رہے اور اس کا ثواب ان کو ملا۔ اسی طرح اگر آپ کسی برائی کے کرنے

ے۔ خداوند تعالیٰ کے قانون یا اس کی حکمت کے تحت روک دیئے گئے، عملاً برائی کر نہیں پائے، لیکن آپ س کا عزمِ صمیم رکھتے تھے تو ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اس کے گناہ سے بچ جائیں گے مثلاً آپ ایک شخص کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے یا بدکاری کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے حتی الامکان آپ نے کوشش کرلی لیکن عملاً اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکے تو اس برائی کا گناہ آپ کے کھاتے میں آئے گا۔ گویا نیکی اور بدی کا جہاں تک تعلق ہے اس کا ثواب یا اس کا عذاب آپ کو ملے گا بشرطیکہ آپ اس کا عزم رکھتے رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ نے اس عزم کو پورا نہ ہونے دیا ہو۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اگر ازل سے یہ جانتا ہے کہ آپ جنت میں جائیں گے یا جہنم میں جائیں گے تو وہ یہ بھی جانتا ہے کہ آپ اپنے اختیار کے ذریعے سے ایسے کام کریں گے کہ جنت میں جائیں گے یا اپنے اختیار کے ذریعے سے ایسے کام کریں گے کہ دوزخ میں جائیں گے۔ اس کو یہ جاننے میں کوئی زحمت نہیں۔ حقیقت میں اس معاملے میں خدا کا علم رکھنا موثر نہیں ہے بلکہ موثر آپ کا اختیار ہے جس کے تحت آپ ہدایت وضلالت اور نیکی و بدی میں سے ایک چیز کا انتخاب کرتے ہیں۔ نتائج اسی انتخاب پر مترتب ہوں گے۔ یہ بات کہ آپ ے اس انتخاب کو خدا بھی جانتا ہے وہ اس سے زائد ایک شے ہے۔

یہ تین چیزیں ہیں جو جبر و اختیار کے مسئلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہی میں ہمارے متکلمین نے ٹھوکر کھائی۔ ان تین مسئلوں کو بخوبی سمجھ لینے سے جبر و اختیار کا مسئلہ الجھن نہیں پیدا کرے گا۔ ہر چیز جس پر آپ سے پرسش ہوتی ہے آپ کو اس کا اختیار ہے۔ اگر آپ کے کسی اختیار کو اللہ تعالیٰ نے رکاوٹ ڈالی ہے تو اس کی نیکی یا بدی کے اجر سے آپ بری نہیں ہوں گے، وہ آپ کو ملے گا۔ ان معاملات میں اللہ تعالیٰ کا علم حقیقت میں فیصلہ کن نہیں ہے، بلکہ آپ کا اختیار فیصلہ کن ہے۔

اسلامی نظامِ معیشت کی صحیح تعبیر :

سوال : اسلامی نظامِ معیشت کو بیان کرتے ہوئے عموماً یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام اس بات پر پابندی نہیں لگا ر کسی شخص کی اتنے ہزار ایکڑ زمین ہو، اتنے جہاز ہوں، اتنی موٹریں ہوں، اتنے کارخانے ہوں، بشرطیکہ اس میں سے شرعی واجبات ادا ہوتے رہیں، کیا یہ بیان درست ہے؟

جواب : اس میں یہ بات بجائے خود تو غلط نہیں ہے کہ اسلام اس بات پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اور یہ

بات بھی صحیح ہے کہ شرعی واجبات اگر ادا ہوتے رہیں تو حکومت اس پر گرفت نہیں کرسکتی۔

لیکن دین کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے۔ شرعی واجبات تو وہ چیز ہیں جو حکومت ڈنڈے کے زور پر وصول کرسکتی ہے۔ اس میں کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اصل چیز جس کے اوپر انسان کی سعادت کا انحصار ہے وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی انفاقِ اختیاری۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ انسان اگر دولت کمائے تو پھر اسی فیاضی کے ساتھ جس فیاضی کے ساتھ خدا نے اس کو دی، وہ خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ انفاق کرے۔ شرعی واجبات کی ادائیگی پر تو آپ اسلامی قانون سے بچ جائیں گے لیکن انفاق کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں بچیں گے۔ اس وجہ سے اسلامی نظامِ معیشت کی مذکورہ تعبیر گویا فقہی قسم کی تعبیر ہوگئی ہے۔ اور اس میں غالباً کمیونسٹوں کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی حکومت کا اصل نصب العین غرباء کے حقوق کا تحفظ ہے۔ یعنی قرآن کی رو سے اسلامی حکومت بہرحال غرباء کے حقوق کی محافظ ہے۔ وہ آپ کے ہاں سے غرباء کا جو قانونی حق ہوگا وہ نکال لے گی اور غرباء ہی کے اوپر اسے صرف کرے گی۔

لیکن اخلاقی کامیابی اور تمام ترقی کا انحصار انفاق فی سبیل اللہ پر ہے۔ حکومت کے قانونی حق سے انفاق کا یہ مقصد پورا نہ ہوگا بلکہ اس کا الگ سے اہتمام کرنا پڑے گا۔ حکومت خود بھی یہ اہتمام کرے گی اور لوگوں کو بتائے گی کہ انفاق فی سبیل اللہ ہی میں معاشرے کی اصل برکت ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ انفاق پوری فیاضی کے ساتھ کریں۔ باقی رہ گیا زکوٰۃ کا معاملہ تو وہ ڈنڈے کے زور سے لے گی۔

یہ یاد رکھیے کہ جس طرح صبر اور شکر پر تمام کردار کی عمارت قائم ہے اسی طریقہ سے نماز اور انفاق پر تمام شریعت کی عمارت قائم ہے۔ نماز سے بندہ خدا سے ٹھیک ٹھیک جڑتا ہے اور انفاق سے وہ بندوں سے ٹھیک ٹھیک جڑتا ہے۔ جو نماز چھوڑ دے وہ خدا سے کٹ گیا اور جس نے انفاق کو چھوڑ دیا وہ معاشرے سے کٹ گیا۔

جو آدمی انفاق نہیں کرتا اس کو ایمان کی حلاوت کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ ایمان کی حلاوت تو نصیب ہونی شروع ہوتی ہے نماز سے اور کامل ہوتی ہے انفاق سے۔ آدمی حقیقت میں زندگی کی اصل لذت اس دن پاتا ہے جس دن اپنی جیب کا آخری پیسہ کسی غریب کی مدد کے لیے خرچ کر دیتا ہے۔ جس معاشرے میں انفاق کی قدر و قیمت ختم ہوگئی وہ یہودی معاشرہ ہے، پھر اس میں اسلام کی حلاوت نہیں ہے۔

انسانی زندگی کا مقصود:

سوال: انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفوس اور سیرت وکردار کی تعمیر بیان ہوا ہے جب کہ عام تصور یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے۔ اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟

جواب: یہ بات کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے، اس بات سے تضاد نہیں رکھتی کہ انبیاء کی بعثت کا مقصود تزکیۂ نفوس ہے یا یہ کہ عبادات وعقائد سے مقصود اعلیٰ سیرت وکردار کو نشوونما دینا ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔

خدا کی عبادت اس اعتبار سے تو بلاشبہ انسانی زندگی کا اصل نصب العین ہے کہ سب سے بڑا حق واجب از روئے عقل وفطرت واز روئے دین وشریعت انسان پر یہی ہے لیکن یہ حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہوسکتی کہ خدا کی عبادت اس لیے مطلوب نہیں ہے کہ خدا اس کا محتاج ہے بلکہ اس لیے مطلوب ہے، کہ ہم اس کے محتاج ہیں۔ اسی چیز سے ہماری زندگی کو حقیقی ارتقاء کے لیے وہ سہارا ملتا ہے جس سے ہماری وہ تمام عقلی وروحانی اور تمام علمی وعملی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں جو ہمارے اندر قدرت نے ودیعت کی ہیں۔ اگر یہ سہارا میسر نہ آئے تو اول تو ہماری زندگی کی اصلی صلاحیتیں بالکل سکڑ کے رہ جاتی ہیں اور اگر کچھ پھیلتی بھی ہیں تو غلط سہارے پکڑ لینے کے سبب سے بالکل غلط سمتوں میں پھیل جاتی ہیں۔ اگر عبادت الٰہی (واضح رہے کہ عبادت کا لفظ میں اس کے حقیقی اور وسیع معنوں میں لے رہا ہوں) اصلی نصب العین کی حیثیت سے پیشِ نظر رہے تو زندگی اس قسم کی کوتاہیوں اور کجرویوں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اس پودے کی مانند پروان چڑھتی ہے جس کو زمین اور فضا دونوں سے بھرپور غذا حاصل ہو رہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام تزکیۂ نفوس کی جو خدمت انجام دیتے ہیں اس میں ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری زندگی کے رُخ کو خدا کی طرف سیدھا کرتے ہیں۔ اس کو صحیح کرنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے عقائد ونظریات ہر قسم کی کجرویوں اور ضلالتوں سے بالکل محفوظ ہو کر توحید خالص کی چٹان پر اس طرح قائم ہو جائیں کہ فسادِ علم ونظر کی کوئی آندھی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ دوسری یہ کہ ہمارے اعمال واخلاق جذبات وخواہشات کی اندھی پیروی سے آزاد ہو کر اعلیٰ عقائد ونظریات یا بالفاظِ دیگر ہمارے اصلی نصب العین (خدا پرستی) سے بالکل ہم آہنگ ہو جائیں۔

اس روشنی میں دیکھئے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کا رُخ پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف ہو (باقی صفحہ ۱۱ پر)